دکھیا شہزادی

پروین شاکر

(خاکہ نگاروں کی نظر میں)

تحقیق، تجزیہ، متن

محمد اکرم سعید

Book's Name: Dukhiya Shehzadi

Written by: Muhammad Akram Saeed

Contact No. 0335-4921473

Arranged by: Professor Dr, Khuram Abbas Virk

Co-ordinated by: Rifat Saeed, Sadia Zafar

Composed & Title Designed by: Ashraf Naqvi

نام کتاب: دُکھیا شہزادی

مصنّف: محمد اکرم سعید

رابطہ نمبر: 0335-4921473

اہتمام: پروفیسر ڈاکٹر خرم عباس ورک

معاونت: رفعت سعید، سعدیہ ظفر

مشینی خطاطی و سرورق: اشرف نقوی 0345-6352439

اشاعت: اوّل......2025ء

قیمت: 2000/- روپے

ملنے کا پتا: مقصود پبلشرز، جیلانی سنٹر، اُردو بازار لاہور

Phone No. 0333-4320521

مشرقی تمیز، تہذیب اور روایات
کے نام

بھیڑیے مجھ کو کہاں پا سکتے
وہ اگر میری حفاظت کرتا

پروین شاکر۔۔۔سوانحی خاکہ

(1952ء۔1994ء)

والد — شاکر حسین ثاقب زیدی

1945ء میں پٹنہ سے کراچی آ گئے۔محکمہ ٹیلی فون اور ٹیلی گراف میں بطور کلرک کام کیا۔

والدہ — افضل النساء کا پٹنہ کے محلّے افضل پور سے تعلق

والدین کی شادی 1949ء میں پٹنہ میں ہوئی۔شادی کے لیے شاکر حسین پٹنہ گئے تھے۔

اولاد — نسرین بانو پیدائش: 14 مارچ 1950ء

پروین شاکر پیدائش: 24 نومبر 1952ء

نانا — سیّد کاظم حسین شاعر تھے۔

پروین حسن عسکری عظیم آبادی کو بھی نانا ہی کہا کرتی تھی جو اُن کی نانی کے پھوپھی زاد تھے۔ابتداء میں پروین نے اُن سے شاعری میں اصلاح لی۔اُن کی بڑی بیٹی کے بیٹے ڈاکٹر ناظم حسین تھا۔

پروین کے نام — پہلا نام: پروین بانو۔پھر پروین بانو شاکر

شناختی کارڈ پر نام — پروین۔بی۔شاکر

دستاویزات میں نام: — پروین بیگم شاکر

بچپن کے نام — پارہ ، پارو ، بینا

ابتدائی تعلیم (پرائمری) اسلامیہ سکول (انگلش میڈیم)
رضویہ کالونی کراچی

پرائمری کے بعد رائزنگ سن سکول چورنگی، مگر یہ سکول ڈیڑھ برس بعد بند ہو گیا۔
پھر رضویہ سکول میں داخلہ ہوا

میٹرک 1966ء رضویہ گرلز ہائی سکول کراچی

ایف اے 1968ء سرسیّد کالج کراچی

اسی کالج میں اُنھیں اپنی اُستاد عرفانہ عزیز سے راہ نمائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ عرفانہ عزیز نے پروین شاکر کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا۔ شعری ادب میں اُن کی راہ نمائی کی اور اُنھوں نے پروین شاکر کا تعارف ریڈیو پاکستان کے ایک پروڈیوسر یاور مہدی سے کرایا اور پروین شاکر ریڈیو پاکستان کے مختلف پروگراموں سے وابستہ رہیں۔

بی۔اے (آنرز انگریزی) 1971ء، سرسیّد کالج، کراچی

ایم۔اے (انگریزی ادب) 1972ء، جامعہ کراچی

ایم۔اے (انگریزی۔لسانیات) 1980ء، جامعہ کراچی

فل برائٹ سکالرشپ ہارٹ فورڈ یونیورسٹی، امریکہ، 1990ء

ایم۔بی۔اے ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ، 1992ء

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی بعنوان ''1971ء کی جنگ میں ذرائع ابلاغ کا

کردار‘‘ (پیش نہ کرسکیں)

پیشہ ورانہ تربیتی کورسز اور امتحانات

سی۔ایس۔ایس 1981ء(پاکستان بھر میں دوسری پوزیشن)

سول سروس اکیڈمی لاہور(دسواں بیچ) 1982ء

ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ آف کسٹم اینڈ ایکسائز کراچی،1983ء

مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم کورس(چھ ہفتے)یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنس لاہور 1992ء

ملازمت

لیکچرار انگریزی۔گورنمنٹ عبداللہ ہارون کالج برائے خواتین کراچی،1973ء- 1981ء

اسسٹنٹ کلکٹر کسٹم ڈیپارٹمنٹ کراچی،1984ء

سیکنڈ سیکرٹری سی۔بی۔آر اِسلام آباد،1986ء

اسسٹنٹ کلکٹر ایکسائز اینڈ سیلز ٹیکس راولپنڈی، 1988ء

اسسٹنٹ ڈائریکٹر کسٹم اینڈ انٹیلی جنس اسلام آباد، 1992ء

ڈپٹی ڈائریکٹر انسپکشن اینڈ ٹریننگ کسٹم اینڈ سنٹرل ایکسائز اسلام آباد،1993ءتاحیات

ازدواجی زندگی

شادی 1976ء

شوہر ڈاکٹرنصیرعلی۔ڈاکٹرنصیرعلی پروین شاکرکی والدہ کی ماموں زاد بہن کا بیٹا تھا۔

بیٹے کی پیدائش (سیّدمرادعلی المعروف گیتو)20نومبر1979ء

ازدواجی زندگی کا خاتمہ (طلاق)1987ء

تصانیف

1۔ خوشبو لاہور،التحریروفنون کے تعاون سے 1977ء

2۔ صدبرگ لاہور،غالب پبلشرز، 1980ء

3۔ خودکلامی اسلام آباد،مرادپبلی کیشنز، 1985ء

4۔ انکار اسلام آباد،مرادپبلی کیشنز، 1990ء

ماہِ تمام (مندرجہ بالا چاروں شعری مجموعوں پرمشتمل کلیات)

اسلام آباد،مرادپبلی کیشنز، 1994ء

5۔ کفِ آئینہ(بعدازمرگ)اسلام آبادمرادپبلی کیشنز،1996ء

ایوارڈز

1۔ آدم جی ادبی ایوارڈ شعری مجموعہ ''خوشبو'' 1978ء

2۔ علامہ اقبال ہجرہ ایوارڈ،شعری مجموعہ ''خودکلامی'' 1985ء

3۔ ظہورنظرایوارڈ،(بھارت) 1986ء

4۔ فیض احمد فیض بین الاقوامی ایوارڈ (دہلی) 1989ء

5۔ صدارتی تمغہ برائے حُسنِ کارکردگی، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد، 1990ء

انتقال

26 دسمبر، 1994ء بوجہ ٹریفک حادثہ

تدفین: ایچ۔ الیون قبرستان، اسلام آباد

❁❁❁❁❁❁❁

(نوٹ)

اِس سوانحی خاکہ کی ترتیب میں

1۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش کی کتاب ''پروین شاکر شخصیت اور فن'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات، 2007ء اور

2۔ ''ماہِ نَو'' پروین شاکر نمبر، لاہور، جلد 75، شمارہ 03 سے بھی مدد لی گئی ہے۔

حُسنِ ترتیب

ضمیمہ جات

دُعا کی خوشبو

پروین شاکر اپنی شاعری کے حوالے سے اُردو اَدب میں ایک اہم مقام و مرتبہ رکھتی ہیں۔ اُنھوں نے ایک جانب تو کامیابی و کامرانی کے جھنڈے گاڑے اور شہرت کی انتہائی بلندیوں کو چُھو لیا اور دوسری جانب زندگی بہت سی اُلجھنوں کا شکار رہی۔ پروین شاکر کی شخصیت کے حوالے سے مختلف اہلِ قلم نے اُس کا خاکہ لکھا ہے۔ ہر شخص کا اپنا نقطۂ نظر اور زاویہ نظر ہوتا ہے۔ خاکہ نگاروں نے جس نظر اور زاویے سے اُس کی شخصیت اور زندگی کے نشیب و فراز کو دیکھا ہے، اُس پر مختصر سا تبصرہ کرنے کے بعد اصل متن دیا ہے تاکہ قارئین خود مصنّف کے نقطۂ نظر کو جان سکیں۔

ہر خاکے کا مآخذ بھی دیا گیا ہے اور تبصرے میں جو اِقتباس خاکے سے لیے گئے ہیں اُن کا صفحہ نمبر مآخذ کے حوالے سے وہیں درج کر دیا گیا ہے۔ اگر وضاحت کے لیے کوئی اور اِقتباس دینا پڑا ہے تو اُس کا ذکر حواشی میں ہے۔ شخصیت کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے چند کتابوں پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے اور اُسے ضمیمہ میں شامل کیا گیا ہے۔

آخر میں عرض یہ ہے کہ پروین شاکر کے انتقالِ پُرملال کے بعد، اُس کے خلاف اسکینڈل بنانے اور اُس کے کردار پر حرف زنی کرنے کی بجائے، اعتبار ساجد صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے

"آئیے ہاتھ اُٹھائیں اور دُعا کی 'خوشبو' اُس تک پہنچانے کی کوشش کریں۔"

دُعا گو

محمد اکرم سعید
چک نمبر 173، رسول پور جٹاں، شیخوپورہ
0335-4921473
15 اپریل، 2025ء

پروین شاکر

یہ خاکہ ایک جہاندیدہ باپ کی پدرانہ شفقت، جواں سال بیٹی کے لیے فکرمندی اور ذمہ داری کے احساس سے لبریز ہے جو اُنھوں نے اپنی ناتجربہ کار اور زمانے کی اُونچ نیچ سے قدرے ناواقف مُنہ بولی بیٹی پروین شاکر کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب اپنی اِس سادہ اور معصوم سی بیٹی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہے اور اُنھیں گھٹیا افراد سے محفوظ رکھنے کے لیے عملی قدم اُٹھاتے رہتے تھے۔ اِس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''پہلے میں نے پروین کو گھٹیا قسم کے افراد سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے نہایت عزیز دوست اور بے حد خوب صورت غزل گو اطہر نفیس کو بیٹی کی دیکھ بھال پر مقرر کر رکھا تھا۔ جعفری (اختر حسین جعفری) صاحب کراچی پہنچے تو پروین کو اطہر صاحب کے علاوہ ایک اور سہارا مل گیا۔ اِس سلسلے میں پروین نے ٹیلی فون پر گفتگو کرتے ہوئے بڑے اطمینان اور آسودگی کا اظہار کیا تھا۔'' (میرے ہم قدم،ص32)

یہ پروین شاکر کی شادی سے پہلے کے انتظامات ہیں جب ابھی وہ اپنے والدین کے گھر میں رہائش پذیر تھی اور اُسے اپنے والد سیّد شاکر حسین زیدی کا مضبوط سہارا بھی میسّر تھا، مگر مُنہ بولے باپ احمد ندیم قاسمی صاحب کو اِتنی فکر تھی کہ وہ لاہور بیٹھے اُس کو محفوظ رکھنے کے لیے سہارے فراہم کر رہے تھے۔ یہ گھٹیا قسم کے لوگ کون تھے اور پروین شاکر کو اُن سے کیا خطرات تھے اور اطہر نفیس صاحب اور اختر حسین جعفری صاحب اُس کی کیسے دیکھ بھال کرتے رہے، اِس کی وضاحت مصنّف نے نہیں فرمائی۔

احمد ندیم قاسمی صاحب سے پروین شاکر کا تعارف 1971ء میں ہوا، جب عبیداللہ علیم نے اُنھیں ''فنون'' میں اشاعت کے لیے پروین شاکر کی کچھ غزلیں اور نظمیں ارسال کیں۔ اور

بقول احمد ندیم قاسمی:

''یہ غزلیں اور نظمیں عنفوانِ شباب کی عشقیہ شاعری کی کامیاب مثالیں تھیں اور پروین کے اس کلام میں معصوم اور بھرپور محبت کے عجیب مسحورکُن تیور تھے۔'' (ص 118)

چونکہ قاسمی صاحب کو شعر و اَدب میں جوہرِ قابل کی ہمیشہ جُستجو رہی ہے، اِس لیے اُنھوں نے ایک خط کے ذریعے پروین کی ان غزلوں کی تحسین کی اور لکھا ''یہ غزلیں بہت ہی پیاری اور معیاری ہیں۔'' بس یہیں سے دونوں کے درمیان مراسلت کا آغاز ہوا، اور مراسلت کا یہ سلسلہ خاصی طویل مُدت پر محیط ہے۔ مگر ان خطوط کی نوعیت بیشتر نجی تھی کیونکہ ''عمّو، بیٹی'' ایک دوسرے کے اِتنے قریب آ گئے تھے کہ اپنے اپنے گھروں اور رِشتوں اور دوستوں کی ذرا ذرا تفصیلات بھی پوری جزئیات کے ساتھ بیان کر دیتے تھے۔ اِس لیے قاسمی صاحب کو افسوس ہے کہ بیشتر خطوط ناقابل اشاعت ہیں۔ بہرحال مراسلت کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور تھوڑے ہی عرصے میں بقول قاسمی صاحب:

''ہمارے درمیان عمّو اور بیٹی کا وہ لازوال رشتہ اُستوار ہو گیا جو بعض نشیب و فراز کے باوجود اور بعض ''مہربانوں'' کی منفی کوششوں کے باوصف قائم رہا۔'' (ص 119)

احمد ندیم قاسمی صاحب نے اِس ''لازوال رِشتے'' کو آخر تک قائم رہنے کا ذکر تو فرمایا ہے مگر ''مہربانوں'' کی منفی کوششوں کو پوشیدہ ہی رہنے دیا ہے۔ اگر ان کی بھی تھوڑی بہت نشان دہی ہو جاتی تو اس خاکے کے مزید بہتر اور دل چسپ ہونے کے امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔ حقائق سے ناواقف ہونے کے سبب اب تو قارئین صرف قیاس آرائیوں پر ہی گزارہ کر سکتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کی پروین شاکر سے پہلی ملاقات 1975ء میں کراچی میں ہوئی اور وہ صورت سے اِتنی سادہ اور معصوم لگی کہ قاسمی صاحب اِس سادگی اور معصومیت کے تأثر کو آخر تک نہ بُھلا سکے اور پھر مراسلت سے تعلق ملاقاتوں تک آن پہنچا۔ اور یہ تعلق اِتنا مستحکم ہوا کہ قاسمی صاحب نے اُسے بیٹی کا درجہ دے دیا اور اپنے مجموعۂ کلام ''دوام'' کے منظوم انتساب کو اپنے خاندان کے چھ افراد کے نام کیا جس میں اُن کی بیوی، بیٹے اور دو بیٹیوں کے علاوہ پروین اور منصورہ بھی شامل تھیں۔ انتساب میں یہ اشعار تھے:

''میری دو اور بیٹیاں ہیں ، جنھیں
منتخب میرے قلب و جاں نے کیا
میری اولاد کی طرح میری ،
ایک پروین ، ایک منصورہ''

(ص120)

جب پروین کی شادی کی بات چلی تو اُس نے اپنے عمّو کو کراچی بلوا بھیجا۔ قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

''میں نے بیٹی کے گھر میں اُس کے منگیتر سے ملاقات کی اور اپنے مثبت تأثر کا اظہار کیا۔ بیٹی نے فرمائش کی کہ شادی کا دعوتی کارڈ لاہور میں چھپے اور اس پر دعوت دینے والے صرف ایک شخص ۔ احمد ندیم قاسمی ۔ کا نام درج ہو۔ یہ بیٹی کی بے محدود محبت کا اِظہار تھا۔'' (ص121)

اور اِظہارِ محبت کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور پھر جب پروین شاکر نے سی۔ ایس۔ ایس میں کامیابی کے بعد فارن سروس میں جانا چاہا تو پروین شاکر کے والدِ گرامی اِنتہائی تشویش کے عالم میں، قاسمی صاحب کے پاس لاہور تشریف لائے اور اُنھیں بتایا کہ میاں بیوی کے درمیان پہلے ہی کشیدگی کی کیفیت ہے، اِس لیے اگر بیٹی فارن سروس میں چلی گئی اور کُرّہ ءارض کے مختلف ممالک میں بھٹکتی پھری تو میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کا اِمکان پیدا ہو جائے گا، جب کہ بیٹی ایک بیٹے ''مراد'' کی ماں بھی بن چکی ہے۔ پروین شاکر کے والدِ محترم نے قاسمی صاحب سے یہ بھی کہا کہ:

''صرف آپ ہی اُسے فارن سروس میں جانے سے روک سکتے ہیں اور آپ کے حکم سے سرتابی کی اُسے مجال نہیں۔'' (ص122)

قاسمی صاحب کو بھی اپنے پروین سے تعلقات اور پدرانہ محبت پر بھرپور اعتماد اور بھروسہ تھا، اِس لیے پروین کے والد کی خواہش پر قاسمی صاحب نے پروین کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے بیٹی کو بہت سمجھایا، اُس کی منتیں کیں۔ اُسے اپنی امّی، اور ابا اور آپا اور بیٹے

کے علاوہ، خود اپنا بھی واسطہ دیا تو اُس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا۔''

(ص122)

اِس ایک اِقتباس سے ہی ''باپ بیٹی'' کی محبت اور تعلق کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک بوڑھا جہاں دیدہ، اُس کی حفاظت کے بارے فکر مند اور اُس کی خوش گوار ازدواجی زندگی کا خواہش مند باپ اُس کی مِنتیں کر رہا ہے، اُسے اپنے قریبی عزیز و اقارب اور خود اپنا واسطہ دے رہا ہے، مگر بیٹی شرمندہ ہونے، معذرت کرنے اور فوری رضامند ہو کر اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کی بجائے سوچنے کا وقت مانگ رہی ہے۔ وہ تو بھلا ہو جنرل ضیاء الحق کا جس نے ایک حکم کے ذریعے پاکستانی خواتین کا فارن سروس میں جانا ممنوع قرار دے دیا۔ اور یوں ''باپ'' کا بھرم رہ گیا، ورنہ خاکے کا رنگ مختلف بھی ہو سکتا تھا۔

سِول سروس اکیڈمی میں ٹریننگ کے لیے پروین شاکر لاہور چلی آئی تو ہر ہفتے کے روز قاسمی صاحب اور منصورہ سے ملنے مجلسِ ترقیِ ادب کے دفتر آیا کرتی تھی۔ وہاں منصورہ اُس کے لیے کھانے کا خاص اہتمام کرتی اور پروین خوب مزے لے لے کے کھاتی اور منصورہ سے اُس کی خاصی دوستی ہو گئی۔ مگر پھر بقول قاسمی صاحب:

> ''چند ''مہربانوں'' نے پروین بیٹی کے نہ جانے کیا کیا کان بھرے اور وہ منصورہ سے بظاہر کِھچی کِھچی سی رہنے لگی۔۔۔۔۔۔ اِس سب کچھ کے باوجود میری فراخ دِل بیٹی منصورہ نے پروین کی آمد پر اُس کی پذیرائی اور مدارات میں کوئی کمی نہ آنے دی۔''

(ص123)

اِس اِقتباس سے بھی دو چار باتیں بڑی نمایاں ہوتی ہیں، ایک تو اس سے قارئین کو خبر ہوتی ہے کہ ''مہربانوں'' کی منفی کوششوں کا سلسلہ کہاں تک دراز تھا اور وہ باپ بیٹی کے ''لازوال رِشتے'' میں رخنے ڈالنے کے لیے کیا کیا جتن کرتے رہے۔ دوسرا، دونوں بیٹیوں کے مزاج اور رویّے کا بھی پتا چلتا ہے۔ ایک بیٹی کھانے کا خاص اہتمام کرتی ہے اور دوسری صرف مزے لے لے کے کھاتی ہے۔ اور ایک بیٹی بڑی فراخ دل ہے اور دوسری کانوں کی کچی ہے۔ بہرحال

کانوں کی کچی اِس بیٹی سے قاسمی صاحب کی محبت اور رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا۔قاسمی صاحب نے ''خوشبو'' سے لے کر'' ماہِ تمام'' تک تمام کتابوں کی اشاعت کا بھی اِس خاکے میں ذکر فرمایا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ہاجرہ بہن کے گھر میں بیٹھ کر ہم باپ بیٹی نے ''خوشبو'' کے مسوّدے پر نظر ڈالی۔اِس ضمن میں بہت دل چسپ بحثیں ہوئیں۔جب میں اپنی سینیارٹی اور تجربہ کاری کے زعم میں اُس کے بعض شعروں اور نظموں کو ردّ کر دیتا تو وہ مجھ سے خاصا زوردار مکالمہ کرتی۔''(ص119)

اِس تجربہ کاری اور مکالمے کا ہی اثر تھا کہ ''خوشبو'' ناقابل یقین حد تک مقبول ہوئی۔

''صد برگ'' کی اشاعت کا اہتمام بھی ''خوشبو'' کی اشاعت کے مطابق قاسمی صاحب ہی کو کرنا تھا،سو اُنھوں نے اس مجموعے کی کتابت بھی کرائی،مگر قاسمی صاحب کے بقول:

''بیٹی کو (اُس کے خیال میں)ایک بہتر ناشر مل گیا۔یہ الگ بات ہے کہ اُس نئے ناشر نے بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔''(ص123)

''خود کلامی'' کی اشاعت کے سلسلے میں ''بیٹی'' نے قاسمی صاحب سے صرف نام کی ''منظوری'' لی۔اور قاسمی صاحب نے بھی'' کچھ سوچے بغیر'' پسندیدگی کا اِظہار کر دیا۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب میں بعض کمزور شاعری بھی شامل ہوگئی۔''انکار'' کا مسوّدہ قاسمی صاحب کی نظر سے ضرور گزرا اور اس میں شامل ''نثری نظموں'' پر اُنھوں نے اعتراض بھی کیا،مگر پروین کی ''ضِد'' کا لحاظ کرتے ہوئے یہ نظمیں رہنے دیں۔

''ماہِ تمام'' کے حوالے سے قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

''بیٹی ہر ملاقات میں مجھ سے مطالبہ کرتی تھی کہ میں اپنی شاعری کی کُلیات چھپواؤں مگر میں نے ہمیشہ معذرت کی۔۔۔۔۔۔۔بیٹی نے اپنے کلام کی کلیات کا مجھ سے کبھی ذکر نہ کیا۔اور پھر ایک روز وہ ''ماہِ تمام'' لے کر میرے پاس آئی۔میں نے کُلیات کی اشاعت مسرّت کا اظہار کیا مگر نام پر میں نے اور منصورہ بیٹی نے اعتراض کیا کہ ''ماہِ تمام'' تو چاند کے زوال کا مفہوم بھی دیتا ہے۔''(ص124)

''ماہِ تمام'' کی اشاعت تک ''بیٹی'' نے قاسمی صاحب کو خبر تک نہیں ہونے دی اور نام تک کی ''منظوری'' نہ لی گئی۔ اِس لیے نام پر قاسمی صاحب اور منصورہ نے مشترکہ اعتراض کیا (اور یہ اعتراض کافی حد تک درست بھی تھا) اور ''کُلیات'' کے چھپنے پر گو مسرّت کا اِظہار فرمایا ہے مگر بین السّطور ایک گِلے اور شکایت کا بھی تاثر ہے۔

طلاق اور شوہر سے علیحدگی کے بعد پروین شاکر کی زندگی میں جو تلاطم برپا تھا اور جس کرب سے وہ دوچار تھی، اور اپنے چھوٹے سے بیٹے کے ساتھ وہ تنہا اسلام آباد جیسے شہر میں زندگی گزار رہی تھی (اور یہاں قاسمی صاحب نے اُس کی حفاظت کا کوئی انتظام بھی نہیں کیا تھا) اُسے نظر انداز کر کے قاسمی صاحب نے پروین کی بے رُخی، خودسری اور گوشہ نشینی کا ذکر ضرور کیا ہے اور یونیورسٹی کی چند طالبات سے اُس کے رُوکھے پن اور بے اعتنائی کے رویّے اور غلط برتاؤ کے خلاف قاسمی صاحب نے احتجاج بھی کیا اور نہایت سخت لہجے کا خط بھی لکھا اور پھر بیٹی نے جب اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار کیا تو قاسمی صاحب نے اپنے ہاتھ سے وہ خط پھاڑ کر پھینک بھی دیا، مگر خاکے میں اُس واقعے کا ذِکر ضروری سمجھا۔ اپنی ذہنی کیفیت کے سبب ''بیٹی'' نے باپ سے ہاتھ ملا کر یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ منصورہ کو لے کر اسلام آباد اُس کے پاس آئیں گے، مگر اُس کی موت تک ایک فکر مند باپ کو یہ وعدہ ایفا کرنے کی فُرصت میسّر نہ آسکی۔

خاکے میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنے اُس دُکھ کا اِظہار کیا جو اُس کی زندگی کے آخری دِنوں میں اُس کی اُداسی کا سبب بنا۔ اسلام آباد میں اہلِ قلم اور اہلِ دانش کی کانفرنس تھی۔ اکادمی ادبیات کے فاؤنڈنگ فیلو اور گورننگ باڈی کے رُکن ہونے کے باوجود قاسمی صاحب کو اِس کانفرنس میں نہیں بلایا جا رہا تھا۔ گو قاسمی صاحب نے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے کسی کو بھی کانفرنس میں شمولیت سے نہ روکا مگر بقول قاسمی صاحب:

> ''میرے اندر دوستی اور محبت کا پندار بے دار رہا جو مجھ سے یہ کہتا رہا کہ میرے فلاں فلاں دوست اور خاص طور سے میری پروین بیٹی تو اِس کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دے گی۔۔۔۔۔ مگر وہ اس میں شامل ہوئی اور مجھے اس کا دُکھ ہوا۔'' (ص 127)

اور قاسمی صاحب نے اپنے اِس دُکھ کا اظہار خط کے ذریعے کیا اور پروین شاکر کو لکھا:

''بیٹی! کانفرنس میں تمھاری شمولیت سے مجھے منصور حلّاج یاد آ رہا ہے جو لوگوں کے پتھر کھا رہا تھا مگر چُپ تھا۔ جب اُس کے ایک اپنے نے اُس پر ایک پھول پتھر کی طرح پھینکا تو وہ بِلک اُٹھا۔'' (ص 127)

گو قاسمی صاحب تو اپنی جگہ ''بلکتے'' رہے مگر بیٹی نے خط کا جواب تک دینا گوارا نہ کیا۔ مگر پھر بھی پروین کی پریشانی پر قاسمی صاحب بے چین ہو جاتے تھے، کیونکہ اُن کے سینے میں ایک باپ کا دردمند دل تھا۔ قاسمی صاحب ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بیٹی کی سال گرہ (۲۴ نومبر ۱۹۹۴ء) پر اُسے فون کر کے مبارک باد دی، مگر اُس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے یا رونے پر ضبط کر رہی ہے۔۔۔۔ میں نے کہا ''بیٹی! یہ غلط ہے، کیا ہو گیا ہے تمھیں، میں نے اُسے سنبھلنے اور اپنی حفاظت کرنے کو کہا مگر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی اُس کی آواز نے مجھے بے چین کر دیا۔ (ص 127)

ایک روتی ہوئی بیٹی کا بے چین باپ فوری طور پر تو اُس کے آنسو پونچھنے اسلام آباد نہ جا سکا، البتہ مسقط سے واپسی پر جانے کا پروگرام ضرور ترتیب دیتا رہا اور اسی اثنا میں یہ غم زدہ بیٹی اپنی بھیگی پلکوں سمیت اس دُنیا سے رُخصت ہو گئی، اور پھر قاسمی صاحب منصورہ بیٹی کو ساتھ لے کر اسلام آباد پہنچے تو پروین کی امّی اور باجی، اُس کی ایک بڑی سی مسکراتی بلکہ ہنستی تصویر کے سائے میں رو رہی تھیں اور قاسمی صاحب کو فانی بدایونی کا یہ شعر رہ رہ کر یاد آ رہا تھا: ؎

مجھے بلا کے یہاں آپ چُھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

میزبان تو انتظار کرتے کرتے مٹی کی چادر اوڑھ کر آرام کی نیند سو گیا تھا مگر اُس کا یہ شعر تو کانوں میں گونج رہا تھا:

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی، اُس نے کمال کر دیا

بہرحال قاسمی صاحب کی اِس تحریر سے پروین شاکر کا جو خاکہ اُبھرا ہے، وہ ایک ذہین، سادہ، معصوم، خوب صورت، عنفوانِ شباب میں عشقیہ شاعری کرتی، ایک ضدی، خودسر، کانوں کی کچی، باپ سے اُلجھتی، بے کار بحثیں کرتی، اُس کے پندار کو ٹھیس پہنچاتی، اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی اور تنہائی کا کرب برداشت کرتی ہوئی وہ شاعرہ ہے جس نے ادب کی دُنیا میں بہت شہرت پائی اور کامیاب رہی۔ مگر نجی زندگی میں تنہائی، اُداسی اور ناکامی اُس کا مقدّر رہی اور باپ کی شفقت، ہمدردی اور بے چینی بھی جس کا مداوا نہ کر سکی۔

❁❁❁❁❁

احمد ندیم قاسمی

پروین شاکر

آج سے رُبع صدی پہلے کا ذکر ہے کہ معروف نوجوان شاعر عبیداللہ علیم (اب مرحوم) نے مجھے کراچی سے خط لکھا تھا اور پروین کی چند غزلیں بھیجی تھیں۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ یہ ایک نہایت ذہین لڑکی کا کلام ہے اور ''فنون'' میں اشاعت کا مستحق ہے۔ میں نے یہ غزلیں اور نظمیں پڑھیں تو اِکّادُکّا مبتدیانہ خامیوں سے قطع نظر وہ عنفوانِ شباب کی عشقیہ شاعری کی کامیاب مثالیں تھیں۔ پروین کے اس کلام میں معصوم اور بھرپور محبت کے عجیب مسحور کُن تیور تھے۔ یہ کلام شاید ''فنون'' کے ستمبر ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شامل ہوا (اور اس کے بعد برسوں تک ''فنون'' کا کوئی بھی شمارہ پروین کی غزلوں اور نظموں سے خالی نہ رہا)۔ مجھے شعروادب میں جوہرِقابل کی ہمیشہ جستجو رہی ہے کہ نئی نسلوں کا یہی جوہر ہمارا مستقبل ہے، چنانچہ میں نے ایک خط میں پروین کی ان غزلوں کی تحسین کی اور واضح طور پر لکھا کہ یہ محض ایک مبتدی کی حوصلہ افزائی نہیں ہے بلکہ یہ غزلیں ہیں ہی بہت پیاری اور معیاری۔ یہاں سے ہمارے درمیان مراسلت کا آغاز ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے درمیان عمّو اور بیٹی کا وہ لازوال رشتہ اُستوار ہوگیا جو بعض نشیب وفراز کے باوجود اور بعض ''مہربانوں'' کی منفی کوششوں کے باوصف، آخر تک قائم رہا۔

مراسلت کا یہ سلسلہ خاصی مدت پر محیط ہے مگر ان خطوط کی نوعیت بیشتر نجی تھی، اِس لیے ان میں سے بیشتر کی اشاعت مناسب نہیں ہوگی۔ دراصل ہم عمّو بیٹی ایک دوسرے کے اِس قدر قریب آگئے کہ اپنے اپنے گھروں اور رِشتوں اور دوستوں کی ذرا ذرا سی تفصیلات بھی پوری جزئیات کے ساتھ بیان کردیتے تھے، چنانچہ افسوس کہ بیشتر خطوط ناقابلِ اشاعت ہیں۔

مشہور ادبی ماہنامہ ''افکار'' نے ''ندیم نمبر'' نکالا تو کراچی کے ہوٹل میٹروپول میں

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زیرِ صدارت، اس کی تقریب ہوئی۔ میں اس تقریب کا مہمانِ خصوصی تھا۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا اور نوجوان طلبا و طالبات نے آٹوگراف حاصل کرنے کے لیے مجھے گھیر لیا تو میں نے دیکھا کہ سٹیج کے ایک گوشے میں پروین بیٹی، اپنی چند سہیلیوں کے ہمراہ میرے محاصرے کے ختم ہونے کی منتظر کھڑی ہے۔ بیٹی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ مجھے صورت سے اِتنی سادہ اور معصوم لگی کہ کم ہی چہرے، پہلی نظر میں اِتنی سادگی اور معصومیت کا تأثر دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں جب بھی کراچی گیا، وہ پی۔ای۔سی۔ایچ سوسائٹی میں بہن ہاجرہ مسرور کے ہاں مجھ سے ملنے آگئی یا میں نارتھ ناظم آباد میں اُس کے گھر چلا گیا۔ ہاجرہ بہن کے گھر میں بیٹھ کر ہم باپ بیٹی نے ''خوشبو'' کے مسوّدے پر پہلی نظر ڈالی۔ اِس ضمن میں بہت دل چسپ بحثیں ہوئیں۔ جب میں اپنی سینیارٹی اور تجربہ کاری کے زعم میں اُس کے بعض شعروں اور نظموں کو ردّ کر دیتا تو وہ مجھ سے خاصا زوردار مکالمہ کرتی۔ انگریزی شاعری اور تنقید پر اُس کی گہری نظر تھی اور اُردو و فارسی شاعری کے اساتذہ کا کلام اُس نے بِالاِستعجاب پڑھ رکھا تھا۔ اگرچہ آخر کار وہ عموماً میری بات مان لیتی تھی (اور میں بھی اپنے بعض اعتراضات سے دست کش ہو جاتا تھا) مگر ہم دونوں کے درمیان اتنی بحث ہوتی تھی کہ اگر وہ محفوظ ہوتی تو ایک دلچسپ نوعیت کے تنقیدی مقالے کی صورت اختیار کر لیتی۔ بیٹی نے جو نظمیں اور غزلیں میرے کہنے پر ''خوشبو'' کے مسودے سے خارج کر دیں، وہ آج بھی میرے پاس کہیں محفوظ رکھی ہیں۔ ''خوشبو'' لاہور کے ایک اشاعتی ادارے ''التحریر'' اور ''مکتبۂ فنون'' کے باہمی تعاون سے شائع ہوئی اور شائع ہوتے ہی ناقابلِ یقین حد تک مقبول ہوئی۔ بیٹی نے یہ کتاب میرے نام معنون کی تھی۔ اُن دِنوں نامور مصوّر صادقین لاہور میں مقیم تھے۔ پروین کی خواہش کے مطابق مَیں نے ''خوشبو'' کا سرورق صادقین سے بنوایا تھا۔ بعد میں اس سرورق کو بیٹی نے فریم میں محفوظ کر لیا تھا۔

میں نے اپنے مجموعۂ کلام ''دوام'' کا منظوم انتساب اپنے چھ اہلِ خاندان کے نام کیا تھا۔ اس میں میری بیوی، بیٹے اور دو بیٹیوں ۔۔۔۔۔ ناہید اور نشاط ۔۔۔۔۔ کے علاوہ پروین اور

منصورہ بھی شامل تھیں اور پروین نے میرے اس انتساب پر نہایت مسرّت اور فخر کا اِظہار کیا تھا۔
اس انتساب کا آخری بند یہ تھا:

میری دو اور بیٹیاں ہیں، جنھیں   منتخب میرے قلب و جاں نے کیا
میری اولاد کی طرح میری   ایک پروین ، ایک منصورہ
غم کی حِدّت میں ان کا طرزِ تپاک   سرد جھونکوں، گھنی گھٹاؤں سا ہے
زندگی کی تمازتوں میں ندیم   پیار اِن بیٹیوں کا چھاؤں سا ہے
روحِ انسانیت کی تجسیمیں
رحمتِ ایزدی کی تصویریں

میرے اِن چھ ''اہلِ خاندان'' میں سے میری بیوی کے علاوہ میری نشاط بیٹی اور میری پروین بیٹی تو مجھ سے بچھڑ چکی ہیں اور اب میں دربارِ خداوندی میں دست بدُعا ہوں کہ میرے بیٹے نعمان کے علاوہ میری بیٹی ناہید اور میری بیٹی منصورہ میری زندگی میں مجھ سے جدا نہ ہوں۔

جب پروین کے والدِ گرامی سیّد شاکر حسین زیدی نے بیٹی کے بیاہ کا پروگرام بنایا تو بیٹی نے مجھے کراچی بلوا بھیجا۔ میں نے بیٹی کے گھر میں اُس کے منگیتر سے ملاقات کی اور اپنے مثبت تأثر کا اظہار کیا۔ بیٹی نے فرمائش کی کہ شادی کا دعوتی کارڈ لاہور میں چھپے اور اس پر دعوت دینے والے صرف ایک شخص ۔۔۔۔۔احمد ندیم قاسمی ۔۔۔۔۔کا نام درج ہو۔ یہ بیٹی کی بے حدود محبت کا اِظہار تھا مگر میں نے اِس پر شدید احتجاج کیا، اور جب بیٹی نے اصرار جاری رکھا تو مجھے غصّے کا اظہار بھی کرنا پڑا، اور آخر طے پایا کہ میرا نام بے شک درج ہو مگر بیٹی کے والد صاحب کے نام کے بعد درج ہو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ (یہ شادی کارڈ میرے ہاں کہیں محفوظ رکھا ہوگا۔) میں نے اس شادی میں شرکت کی۔ شرکت کرنے والے دوسرے بہت سے احباب میں سے مجھے اِس وقت صرف چند نام یاد ہیں: ۔۔۔۔۔۔۔اطہر نفیس، اختر حسین جعفری، فہمیدہ ریاض اور شاید فاطمہ حسن بھی۔

جب بیٹی رُخصت ہوئی تو میں نے اُسے پُرسکون اور آسودہ اور بھرپور مستقبل کی دُعائیں دیں مگر دربارِ خداوندی میں میری ان دُعاؤں کو شاید بار نہ مل سکا۔

سرسیّد گرلز کالج میں انگریزی کی لیکچررشپ کے دوران بیٹی نے سی۔ایس۔ایس کے مقابلے کے امتحان میں حصہ لیا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔اُن سے فورن سروس (Foreign Service) میں جانا پسند کیا تو اُس کے والدِ گرامی انتہائی تشویش کے عالم میں لاہور تشریف لائے اور مجھے بتایا کہ میاں بیوی کے درمیاں پہلے ہی کشیدگی کی کیفیت ہے،اِس لیے اگر بیٹی فورن سروس میں چلی گئی اور کُرّہ ارض کے مختلف ممالک میں بھٹکتی پھری تو میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کا اِمکان پیدا ہو جائے گا۔جبکہ اب بیٹی ایک بیٹے مراد کی ماں بھی بن چکی ہے۔اُنھوں نے کہا کہ صرف آپ ہی فورن سروس میں جانے سے روک سکتے ہیں اور آپ کے حکم سے سرتابی کی اُسے مجال نہیں۔میں نے بیٹی کو بہت سمجھایا،اُس کی منتیں کیں۔اُسے اپنی امّی اور ابّا اور آپا اور بیٹے کے علاوہ خود اپنا واسطہ بھی دیا تو اُس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا۔اِسی اثنا میں جنرل ضیاءالحق کے حکم کے مطابق پاکستانی خواتین کا فورن سروس میں جانا ممنوع قرار دے دیا گیا اور یہ اُلجھن بالواسطہ طور پر خود ہی سلجھ گئی۔بیٹی نے کسٹمز کا محکمہ پسند کیا مگر میاں بیوی میں علیحدگی مقدّر ہو چکی تھی سو ہو گئی۔

سول سروس اکیڈمی میں ٹریننگ کے دوران وہ ہر ہفتے کے روز مجھ سے اور منصورہ بیٹی سے ملنے مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور کے دفتر میں آتی۔منصورہ اُس کے لیے کھانے کا خاص اہتمام کرتی اور پروین خوب مزے لے لے کے کھاتی۔منصورہ بیٹی سے اُس کی خاصی دوستی ہو گئی مگر بعد میں چند ''مہربانوں'' نے پروین بیٹی کے نہ جانے کیا کیا کان بھرے اور وہ منصورہ سے بظاہر کھچی کھچی سی رہنے لگی۔یہ الگ بات ہے کہ کراچی اور اسلام آباد سے کبھی کبھار وہ اُسے خط بھی لکھتی رہی کہ میرے عمّو کا بہت خیال رکھا کرو۔اس سب کچھ کے باوجود میری فراخ دل بیٹی منصورہ نے پروین کی آمد پر اُس کی پذیرائی اور مدارات میں کوئی کمی نہ آنے دی،جس سے پروین بہت متاثر ہوتی تھی۔اور پھر یہ اُس کے الم ناک انتقال سے چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ اُس نے منصورہ کے سلسلے میں اپنے رویّے کی معذرت کی اور تاکید کی کہ اب منصورہ اور عمّو کو اسلام آباد میں میرے ہاں ٹھہرنا ہوگا۔

''صد برگ'' کی اشاعت کا اہتمام بھی ''خوشبو'' کی اشاعت کے مطابق مجھے ہی کرنا تھا،سو

مَیں نے اس مجموعے کی کتابت کرائی مگر بیٹی کو (اس کے خیال میں) ایک بہتر ناشر مل گیا، چنانچہ میں نے پوری کتابت اُس کے حوالے کر دی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نئے ناشر نے بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ ’’خود کلامی‘‘ کی اشاعت کے سلسلے میں بیٹی نے مجھ سے صرف کتاب کے نام کی ’’منظوری‘‘ لی اور میں نے اس نام سے پسندیدگی کا اظہار یہ سوچے بغیر کر دیا کہ سال دو سال پہلے رام پور (بھارت) کے ایک معروف شاعر، اظہر عنائتی کا مجموعہ کلام اِسی نام سے چھپ چکا تھا بلکہ میں نے اس مجموعے کا فلیپ بھی لکھا تھا۔ ’’خود کلامی کا مسودہ میری نظر سے نہ گزر سکا مگر کتاب کی اشاعت کے بعد میں نے اس میں شامل بعض کمزور حصوں کی نشان دہی کی تو بیٹی نے مجھ سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اپنا کوئی بھی مجموعہ مجھے دِکھائے بغیر نہیں چھپوائے گی، چنانچہ اُس نے یہی کیا۔ ’’انکار‘‘ کا مسودہ میری نظر سے گزرا۔ میں نے اُس میں شامل ’’نثری نظموں‘‘ کی شمولیت پر اعتراض کیا۔ میں نے کہا کہ جو پروین معیاری موزوں کلام کہنے پر حاوی ہے اُسے یہ ’’تماشا‘‘ دِکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر اُس نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیا کہ عمّو! یہ نثری چیزیں بس اِسی صورت میں مجھ پر اُتریں اور میں نے اپنے انسپریشن کا کہا مانا۔ چنانچہ میں نے اُس کی ضد کا لحاظ کیا اور ’’انکار‘‘ میں نثری نظمیں شامل رہنے دیں۔

بیٹی ہر ملاقات میں مجھ سے مطالبہ کرتی تھی کہ میں اپنی شاعری کی کُلیات چھپواؤں، مگر میں نے ہمیشہ معذرت کی اور کہا کہ نئے پرانے شعرا کے درمیان تو کلیات کی دوڑ لگ گئی ہے۔ یہ دوڑ ختم ہولے تو سوچوں گا۔ بیٹی نے اپنے کلام کی کُلیات کا مجھ سے کبھی ذکر نہ کیا اور پھر ایک روز وہ ’’ماہِ تمام‘‘ لے کر میرے پاس آئی۔ میں نے کلیات کی اشاعت پر مسرّت کا اِظہار کیا مگر نام پر مَیں نے اور منصورہ بیٹی نے اعتراض کیا کہ ’’ماہِ تمام‘‘ تو چاند کے زوال کا مفہوم بھی دیتا ہے، مگر وہ جواب میں صرف مسکراتی رہی۔

۱۹۹۴ء کے وسط کا ذکر ہے، وہ مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور کے دفتر میں میرے پاس بیٹھی تھی اور منصورہ بیٹی حسبِ معمول بیٹی کی مدارات کے انتظامات میں مشغول تھی جب یونیورسٹی کی چند

طالبات پروین کی آمد کی اطلاع پا کر اُس سے ملنے آنکلیں۔ اُنھوں نے بیٹی سے ایک دو سوال پوچھے مگر بیٹی نے عجیب بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُنھیں ٹال دیا۔ اُنھوں نے بیٹی سے اسلام آباد کا پتہ مانگا تو بیٹی نے ایک چٹ پر پتہ لکھ کر۔۔۔۔۔''مُنہ پھیر کر اِدھر کو، اُدھر کو بڑھا کے ہاتھ'' کے مصداق یہ چٹ ایک طالبہ کو پکڑا دی۔ جب بیٹی چلی گئی تو میں نے اُسے نہایت سخت لہجے کا ایک خط لکھا۔ میں طالبات کے ساتھ اُس کے غلط برتاؤ کے خلاف احتجاج کیا اور اُسے بتایا کہ تمھاری مقبولیت میں ان نوجوان طالبات وطلبا کی پسندیدگی کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ تم نے ان سے بدسلوکی کی اِس طرح کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔ میرے ساتھ بیٹی کی بے پناہ عقیدت اور لازوال محبت کا یہ ایک اور ثبوت ہے کہ خط ملتے ہی بیٹی فوراً اسلام آباد سے لاہور پہنچی، اور جب منصورہ بیٹی اس پیارے مہمان کی مدارات کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی اور کمرے میں ہم عمّو بیٹی رہ گئے تو میں نے اپنے خط کا پوچھا۔ اُس نے کہا کہ آپ کے پاس میری آمد، اس خط کا جواب ہے۔ آپ کا وہ خط میرے پرس میں ہے۔ آپ نے مجھ پر جائز تنقید کی ہے۔ مجھے اپنی رَوِش کو بدلنا ہوگا، مگر عمّو! میں تھک سی گئی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر کے معمول میں مبتلا کر لیا ہے۔ میں کسی تقریب میں شامل ہوتی ہوں تو بالکل مجبور ہو کر شامل ہوتی ہوں۔ گھر میں مجھ سے جو بھی ملنے آتا ہے، اُسے پیغام بھجوا دیتی ہوں کہ میرے دفتر میں تشریف لائیے گا کہ گھر میں میرے پاس کسی سے ملاقات کا وقت نہیں ہوتا۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، اِس لیے گوشہ نشین سی ہوگئی ہوں۔ بہر حال اپنی اِس ذہنی کیفیت کے باوجود، آپ کے ارشاد کے مطابق آئندہ اپنے ملنے والوں کے ساتھ وہ Attitude اِختیار نہیں کروں گی جس پر آپ معترض ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ بیٹی! اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ اُس نے میرا خط اپنے پرس سے نکالا اور مجھے پکڑاتے ہوئے فرمائش کی کہ میں اسے اپنے ہاتھ سے پھاڑ کر پھینک دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اُس نے مکمل طور سے Relax ہو کر منصورہ اور میرے ساتھ کھانا کھایا۔ اُس روز اُس نے مجھ سے گِلہ کیا کہ ''آپ جب بھی اسلام آباد آتے ہیں تو کہیں اور ٹھہر جاتے ہیں جبکہ اس شہر میں آپ کی

بیٹی کا گھر موجود ہے۔ مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آئندہ آپ اسلام آباد آئیں گے تو منصور کو ہمراہ لائیں گے اور آپ دونوں میرے ہاں ٹھہریں گے اور آپ کی واپسی بھی میری اجازت سے ہوگی۔'' میں نے اُس کی یہ فرمائش قبول کرلی تو وہ بولی ''یوں نہیں، ہاتھ ملا کر وعدہ کیجیے۔'' میں نے اُس سے ہاتھ ملا کر اپنا وعدہ دہرایا اور وہ نہایت خوش خوش رُخصت ہوئی۔

مجھے دُکھ ہے کہ میں اُس کے آخری دِنوں میں اُس کی اُداسی کا سبب بنا۔ اُس نے فون پر مجھے بتایا کہ ''یہ جو اہلِ قلم اور اہلِ دانش کی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے، اُس کا پروگرام آج کے اخبار میں چھپا ہے مگر عمّو! You are no where. اِس لمبے چوڑے پروگرام میں آپ کہیں دِکھائی نہیں دِیے جبکہ آپ اکادمی ادبیات کے فاؤنڈنگ فیلو بھی ہیں اور اس کی گورننگ باڈی کے رُکن بھی۔ اس پر میں نے اکادمی والوں کو فون پر صرف یہ کہا کہ مجھے کانفرنس کا پروگرام تو بھجوادیجیے۔ جواب ملا کہ یہ پروگرام آج ہی بھجوادیا گیا ہے۔ ویسے یہ پروگرام آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ اِسی بنا پر میں نے کانفرنس میں شمولیت کرنے سے انکار کردیا۔ میں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے کسی کو بھی کانفرنس میں شمولیت سے نہ روکا۔ البتہ میرے اندر دوستی اور محبت کا پندار بیدار رہا جو کہتا رہا کہ میرے فلاں فلاں دوست اور خاص طور سے میری پروین بیٹی تو اِس کانفرنس میں شرکت سے انکار کردے گی جس میں شمولیت سے میں نے انکار کردیا تھا۔ مگر وہ اس میں شامل ہوئی اور مجھے اس کا دُکھ ہوا۔ میں نے بیٹی کو ایک مختصر سا خط لکھا کہ کانفرنس کے پروگرام کے بارے میں تو مجھے کوئی بھی مطلع کرسکتا تھا مگر بیٹی! کانفرنس میں تمھاری شمولیت سے مجھے منصور حلاّج یاد آرہا ہے جو لوگوں کے پتھر کھا رہا تھا مگر چُپ تھا۔ البتہ جب اُس کے ایک اپنے نے اُس پر ایک پھول، پتھر کی طرح پھینکا تو وہ بلک اُٹھا۔

بیٹی نے مجھے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر گزشتہ سال ہا سال کے معمول کے مطابق میں نے بیٹی کی سالگرہ (۲۴ نومبر ۱۹۹۴ء) پر اُسے ایک تحفہ بھیجا۔ ایک تحفہ منصورہ بیٹی کی طرف سے بھی تھا۔ ۲۴ نومبر کو ''ہیپی برتھ ڈے'' کہنے کے لیے ہم نے بیٹی کو فون کیا۔ پہلے منصورہ بیٹی نے

پروین بیٹی کو مبارک باد دی اور اُس نے بتایا کہ آپ لوگوں کے بھیجے ہوئے تحائف مجھے ابھی ملے ہیں اور میرے سامنے میز پر رکھے ہیں۔ پھر میں نے اُسے مبارک باد دی مگر اُس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے یا رونے پر ضبط کر رہی ہے۔ وہ نہایت مدھم آواز میں رُک رُک کر بول رہی تھی۔ میں نے کہا ''بیٹی! یہ غلط ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ مگر اُس نے اسی لہجے میں جواب دیا'' نہیں عمو! کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں عمّو۔'' میں نے اُسے سنبھلنے اور اپنی حفاظت کرنے کو کہا مگر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی اُس کی آواز نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔

میں نے اور منصورہ بیٹی نے طے کیا تھا کہ جب میں دسمبر کے آخر میں یومِ پاکستان کے سلسلے میں مسقط سے ہو آؤں گا تو ہم دونوں ۔۔۔۔۔۔ بابا، بیٹی ۔۔۔۔۔ پروین بیٹی کے پاس اسلام آباد جائیں گے اور کم سے کم ایک ہفتہ اس کے پاس ٹھہریں گے۔

مسقط ہی میں مجھے اور احمد فراز صاحب کو اِس المناک حادثے کا علم ہوا جس نے میری بیٹی مجھ سے چھین لی۔ میں فوراً لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ بیٹی کو تو حادثے کے روز ہی دفنا دیا گیا تھا۔ میں نے منصورہ بیٹی کو ساتھ لیا اور اسلام آباد پہنچا۔

ہم دونوں پروین بیٹی کے گھر پہنچے تو مجھے فانی بدایونی کا یہ شعر رہ رہ کر یاد آ رہا تھا:

مجھے بُلا کے یہاں، آپ چُھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

وہاں اُس کے گھر میں اُس کی ایک بڑی سی مسکراتی بلکہ ہنستی ہوئی تصویر کے سائے میں اُس کی امّی اور باجی رو رہی تھیں اور کمرے کی فضا میں، یا شاید میرے کانوں میں پروین کے آخری کلام کا یہ شعر گونج رہا تھا:

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی، اُس نے کمال کر دیا

(احمد ندیم قاسمی۔۔ میرے ہم قدم)

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

’’خوش بو‘‘ والی شاعرہ۔۔۔۔۔پروین شاکر

ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک صاحب نے اپنے اِس خاکے میں پروین شاکر کی شاعری اور شخصیت کو ’’رلاملا کر‘‘ پیش کیا اور اُس کی شاعری ہی سے اُس کی مورت بنائی اور شاعری کے لوگوں، خاص طور پر نوجوان نسل پر اُس کے اثرات اور انھی اثرات کے سبب مرد حضرات کی سائیکی بیان کی ہے۔ شگفتہ اور تیز و تند جملوں میں ڈاکٹر موصوف بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور اِس خاکے میں بھی اُن کا یہ اسلوب اپنے جوبن پر ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کے بارے لکھتے ہیں:

’’پروین کی شاعری مرد کے گرد گھومتی ہے اور مرد اِس کے۔۔۔۔۔۔اس نے ہر عورت کے جذبات کو زبان دے دی ہے، جب کہ ہر مرد اِس سے زبان لینے کو تیار ہے، کہتے ہیں اِس اکیلی نے پوری عورت ’’برادری‘‘ کی نمائندگی کی ہے۔ اس کے مداحین کی تعداد سے اِس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے۔‘‘(ص149)

اِس اقتباس سے صرف پروین شاکر کی شاعری ہی نہیں، مرد کی ذہنیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اِس مذکورہ خاکے میں پروین شاکر کو کم اور اس ’’مردانہ ذہنیت‘‘ کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

’’مردوں میں اس کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ یہ عورت ہے، دوسری، تیسری اور چوتھی وجہ بھی یہی ہے۔ جب کہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی شاعری میں عورت کو ’’فطری خواہشات‘‘ کے ساتھ پیش کیا ہے اور مسٹر اُلّو کا کہنا ہے کہ عورت کو فطری خواہشات کے ساتھ دیکھنا ہر مرد کی فطری خواہش ہوتی ہے۔‘‘(ص151)

پروین شاکر کا جرم یہی ہے کہ وہ ایک عورت ہے اور ایک ایسی عورت، جس نے عورت کی فطری خواہشات کو شاعری کے خوب صورت پیرائے میں بیان کر دیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر صاحب:

’’ہر دوسرا نوجوان اس کی شاعری کا دیوانہ ہے اور ہر پہلا اس کا۔۔۔۔۔اس نے جن خواہشات کا اظہار شاعری کی زبان میں کیا ہے، اگر اپنی زبان میں کرتی تو ایک ایک خواہش ایسی تھی کہ ہر خواہش پر ہزاروں کے دم نکلتے۔‘‘(ص149-148)

ڈاکٹر صاحب نے اپنے شریر اور شوخ جملوں سے مرد کی سوچ، ذہنیت اور رویّے کو نمایاں کیا ہے۔ بظاہر یہ جملے بڑے شگفتہ ہیں مگر پس منظر میں درد کی ایک لہر اور مرد کی حاکمیت کا تصوّر اور عورت کی بے بسی کی کیفیت بھی بڑی نمایاں ہے۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

’’مردوں نے پوری اُردو شاعری میں جتنے سوال اور ستم اُٹھائے تھے، یہ اُن کا جواب بن کے رہ گئی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ پہلی عورت ہے جس نے خوب صورت شاعری کی ہے جب کہ مسٹر اُلّو کہتا ہے، یہ پہلی خوب صورت عورت ہے جس نے شاعری کی ہے۔۔۔۔ اِس کی آدھی کتابیں تصویر کی وجہ سے بکیں اور آدھی تصوّر کی وجہ سے۔(تصویر اس کی، تصوّر لوگوں کا)‘‘(ص149)

مرد کی نظریں اس کی خوب صورتی اور اس سے بندھے تصوّر ہی میں اٹکی رہی ہیں۔یعنی وہ اس کی تصویر اور تصوّر سے باہر نہیں نکل سکے۔اس سے ہی ’’مردانہ سوچ‘‘ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پروین شاکر کی زندگی کے سب سے بڑے دُکھ اور المیے کو بھی ایک مرد اور مزاح نگار کی آنکھ سے دیکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

’’سائنس اور ادب دو مختلف میدان ہیں۔اس نے دو متضاد سِروں کو ملانے کی کوشش میں ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ایک طرف دل ہی دل تھا اور دوسری طرف دماغ ہی دماغ۔ یہ عشق و محبت سے دو چار، وہ دو اور دو چار۔اس نے اُسے سمجھانے کی بہتیری کوشش کی کہ

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اُس بے ذوق نے اِس جذبے کو بھی سائنسی انداز میں پرکھنے کی کوشش کی اور اِسے ہی چھوڑ گیا۔‘‘(ص151)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی خاکہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بعض مقامات، بلکہ اکثر مقامات تو ان کی تحریر میں اتنے شریر، شوخ اور چلبلے ہیں کہ وہاں ''واوین'' کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ بالکل مشتاق احمد یوسفی کی تحریر کی طرح۔ لیکن وِرک بھی یوسفی ہی کی طرح ان مقامات سے یوں معصومانہ گزر جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو یا یوں کہنا چاہیے کہ جیسے اُنھوں نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔''

(''ورک کی مزاح نگاری۔۔۔۔ایک تاثر''مشمولہ خاکہ نگری (ص12-13)

پروین شاکر کے حوالے سے بھی ڈاکٹر صاحب ایسے ہی گزرے ہیں، جیسے انھوں نے ''کچھ'' کیا ہی نہیں۔ بہر حال مجموعی طور پر خوب صورت، شریر اور شوخ جملوں پر مشتمل یہ خاکہ صرف پروین شاکر کی شخصیت، شاعری اور شاعری کے نوجوان نسل پر اثرات ہی کو اُجاگر نہیں کرتا بلکہ مرد کی سوچ، ذہنیت اور رویّے کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شگفتگی اور شوخی کے پیچھے درد کی ایک کیفیت بھی دِکھائی دیتی ہے۔ اِسی شوخی اور درد نے اس خاکے کو بہت خوب صورت، بہت پُراثر اور دل فریب بنا دیا ہے اور خاکہ پڑھنے کے بعد بھی بہت عرصے تک ڈاکٹر صاحب کے یہ جملے یاد رہتے ہیں:

'' کہتے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل کو وقت سے پہلے بالغ کرنے میں تین چیزوں کا ہاتھ ہے، گرمی، غربت اور پروین شاکر۔۔۔۔۔۔اگر نوجوان نسل ہماری قوم کا سرمایہ ہے تو یہ سرمایہ اس نے لوٹ لیا ہے۔''(ص148)

اب پتا نہیں اِس ''لوٹ مار'' پر پروین شاکر سے گِلہ کرنا چاہیے، اُسے داد دینی چاہیے یا اُس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ خاکہ وکھری ٹائپ کا ہے۔ اس میں پروین شاکر کی شخصیت، شاعری، مرد کی سائیکی (سوچ)، شوخ اور شریر اسلوب نے عجیب (قوسِ قزح جیسے) رنگ بکھیرے ہیں۔ ایک ایک جملہ میں شوخی، شرارت اور معنی کا وکھرا اکھلا رہے۔ مزاح اور درد کی لہریں بھی ساتھ ساتھ بہہ رہی ہیں۔ یوں جیسے کِکلی ڈالتی مُٹیاروں کی گھُمر اور حُسن رل مل گئے ہوں۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک

خوشبو والی شاعرہ (پروین شاکر)

کہتے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل کو وقت سے پہلے بالغ کرنے میں تین چیزوں کا ہاتھ ہے۔ گرمی، غربت اور پروین شاکر۔ اور انھیں دیر تک جوان رکھنے میں صرف مؤخرالذکر کا۔ اس کی ''خوشبو'' آج نوجوانوں کے دل و دماغ میں اِس قدر رچی بسی ہوئی ہے کہ یہ ''خود کلامی'' بھی کر رہی ہو تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم کلامی کر رہی ہے۔ اس کی آخری کتاب کا نام ''انکار'' ہے۔ میرے دوست مسٹر اُلّو کا کہنا ہے کہ اس کتاب کے پیچھے چھپی ہوئی تصویر دیکھ لی جائے تو یہ انکار بھی اقرار لگنے لگتا ہے۔ یہ چار کتابوں اور ایک بیٹے کی خالق ہے۔ اس کا تخلیقی سفر اب بھی جاری ہے مگر صرف کتابوں کی حد تک۔

اگر نوجوان نسل ہماری قوم کا سرمایہ ہے تو یہ سرمایہ اس نے لُوٹ لیا ہے اور اب تو اُردو سمجھنے اور ڈائیلاگ بولنے والا ہر دوسرا نوجوان اس کی شاعری کا دیوانہ ہے اور ہر پہلا اس کا۔ ویسے بھی اس کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ذہین ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا ضروری جوان ہونا۔ اب تو سُنا ہے کہ ڈاکٹر علاج کے لیے آنے والے نوجوانوں کو جن گرم چیزوں سے پرہیز کی ہدایت کرتے ہیں، اُن میں اس کی شاعری بھی شامل ہے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی بچوں کو ملامت اور عورت کو ملائمت سے دیکھنا قابلِ مذمّت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے جن خواہشات کا اظہار شاعری کی زبان میں کیا ہے اگر اپنی زبان میں کرتی تو ایک ایک خواہش ایسی تھی کہ ہر خواہش پہ ہزاروں کے دم نکلتے۔ یہی تو شاعری کا ایک بڑا فائدہ ہے کہ جو باتیں عام حالات میں چھپانے کے قابل ہوتی ہیں، شاعری میں وہ چھپنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔

اسے زبان (اُردو زبان اور اپنی زبان) پر پوری گرفت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ و استعارات و حضرات اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں۔ جو چاہتی ہے لکھ دیتی ہے، لوگ بھی وہی چاہتے ہیں جو لکھ دیتی ہے۔ مردوں نے پوری اُردو شاعری میں جتنے سوال اور ستم

اُٹھائے تھے، یہ اُن کا جواب بن کے رہ گئی ہے۔ اِتنی سی عمر میں اس نے اتنے کام کر لیے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ آگے چل کر یہ کیا کچھ نہیں کرے گی۔ جب کہ مسٹر اُلّو کا کہنا ہے کہ ایسے کام صرف اِسی عمر میں ہو سکتے تھے۔

یہ پہلی شاعرہ ہے جس نے ادب سے روپیہ بھی کمایا ہے، وگرنہ ہمارے ہاں تو بڑے نامی گرامی شعرا و ادبا کی مالی حالت ایسی ہوتی ہے، جیسے مشرقی پنجاب میں نائیوں حجاموں کی۔ اس کی آدھی کتابیں تصویر کی وجہ سے بکیں اور آدھی تصوّر کی وجہ سے۔ (تصویر اس کی، تصوّر لوگوں کا) کہتے ہیں کہ یہ پہلی عورت ہے جس نے خوب صورت شاعری کی ہے۔ جب کہ مسٹر اُلّو کہتا ہے کہ یہ پہلی خوب صورت عورت ہے جس نے شاعری کی ہے۔ ہمارے ہاں بہت سی خواتین نے کل وقتی شادی کی خاطر جز وقتی شاعری کی قربانی دے دی۔ اِس نے اُن کے اُلٹ کیا۔ ہمارے ناقدین کو آج تک سمجھ نہیں آئی کہ اسے کون سا مقام دیں؟ اس کے خاوند کے لیے بھی یہی مسئلہ تھا۔ شاعری میں اس کا پسندیدہ موضوع معاشرتی کش مکش ہے جس کی ایک بڑی وجہ یہ خود بھی ہے۔ ہماری پوری اُردو شاعری عورت کے گرد گھومتی ہے۔ پروین کی شاعری مرد کے گرد گھومتی ہے اور مرد اِس کے۔ اسے طلبا و طالبات کے نصاب میں شامل ہونے کو ابھی وقت لگے گا اور نصابِ عشق سے نکلنے میں۔ اس نے ہر عورت کے جذبات کو زبان دے دی ہے جب کہ ہر جذباتی مرد اس سے زبان لینے کو تیار ہے۔ کہتے ہیں اِس اکیلی نے پوری عورت ''برادری کی نمائندگی کی ہے۔ اس کے مداحین کی تعداد سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

حضرت اقبال کو ہمیشہ یہ شکوہ رہا کہ ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس کے اعصاب پہ عورت سوار ہے (حالانکہ اقبال خود ایک عرصے تک محض ایک عدد پھول کے عطیے سے فیض یاب ہونے پر باغ باغ ہو جایا کرتے تھے اور کائنات کی جملہ رنگینیوں کا سبب وجودِ زن کو ٹھہراتے رہے) وہ شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ تخلیق کار مرد ہو تو اُس کے ذہن پہ ایک وقت میں ایک عورت سوار ہوتی ہے۔ لیکن اگر تخلیق کار ہی بقلم خود عورت ہو تو وہ اکیلی ہر ایک کے اعصاب کیا، سر پہ سوار ہو جاتی ہے اور پھر شاعر نے کہا ہے کہ:

''یہ دردِ سر ہے ایسا کہ سر جائے تو جائے ہے''

یہ تو ویسے بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ عورت گواہی میں آدھی، آگہی میں پوری، گہرائی میں دوگُنی اور گمراہی میں کئی گنا ہوتی ہے۔

اِسے ''بنانے'' میں خدا تعالیٰ اور احمد ندیم قاسمی کا خاصا ہاتھ ہے۔ شکل و شہرت ایسی کہ خاموش بھی ہو تو بولتی ہوئی لگتی ہے۔ ٹی وی پہ ہمیشہ بال اور دل کھول کے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعرہ کم شاعری زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری سچے جذبوں اور جھوٹے مردوں پہ محیط ہے۔ شعروں میں اتنا خلوص اور اپنائیت ہوتی ہے کہ ہر بندہ سمجھتا ہے مجھ سے مخاطب ہے۔ اس نے اپنی ایک کتاب کے انتساب میں لکھا ''مراد تیرے نام'' جسے پڑھ کے کئی اسم پھرے منزلِ مراد شاد باد کے حصول کے لیے نامراد سے مراد بن بیٹھے۔ اُنھیں بعد میں پتا چلا کہ مراد اس کے بیٹے کا نام ہے۔ اسے زعم ہے کہ اس نے کتابوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بھی بہت پڑھا ہے۔ مسٹر اُلّو کہتا ہے کہ اتنا اس نے لوگوں کو نہیں پڑھا جتنا لوگوں نے اسے پڑھا ہے۔

بڑے شاعر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ مُردوں میں نئی روح پھونک دیتا ہے۔ یہ بھی بڑی شاعرہ ہے (خاکم بدہن عمر میں نہیں) اِس نے بھی مَردوں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اِس نے عورت کو مرد کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلنے کا حوصلہ عطا کیا ہے اور نوجوان نسل میں اِس قدر خود اعتمادی پیدا کر دی ہے کہ کل تک جو لڑکیاں ہر بات پر ''وائی'' یا ''ناٹ'' کہتی تھیں، اب صرف ''وائی ناٹ'' کہتی ہیں۔ پہلی خاتون دیکھی ہے جو شادی کے بعد بھی اتنی ہی مقبول ہے بلکہ اب تو اس کے پاؤں کے نیچے جنت بھی ہے، لوگ اب بھی اس کے ساتھ دوزخ میں جانے کو تیار ہیں۔ میں نے اسے بہت کم ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔ جس کی ایک وجہ مسٹر اُلّو یہ بتاتا ہے کہ میں نے اسے بہت کم دیکھا ہے۔ مردوں میں اس کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ یہ عورت ہے، دوسری، تیسری اور چوتھی وجہ بھی یہی ہے۔ جب کہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی شاعری میں عورت کو فطری خواہشات کے ساتھ پیش کیا ہے اور مسٹر اُلّو کا کہنا ہے کہ عورت کو فطری خواہشات کے ساتھ دیکھنا ہر مرد کی فطری خواہش ہوتی ہے۔

یہ اگر عورت کی بجائے کوئی ڈیپارٹمنٹ ہوتی تو یقیناً فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ ہوتی۔

مارکیٹ ہوتی تو لبرٹی، موسم ہوتی تو خزاں و بہار کا سنگم ہوتی، دریا ہوتی تو چناب، روڈ ہوتی تو مال روڈ، سیاست دان ہوتی تو بے نظیر، ثقافت ہوتی تو ہندی، نظام ہوتی تو جمہوریت کا، جسم کا کوئی عضو ہوتی تو دل، کوئی جذبہ ہوتی تو محبت ہوتی اور اگر انسانی زندگی کا کوئی لمحہ ہوتی تو قیامت ہوتی۔

سائنس اور ادب دو بالکل مختلف میدان ہیں۔ اس نے دو متضاد سروں کو ملانے کی کوشش میں ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ ایک طرف دل ہی دل تھا اور دوسری طرف دماغ ہی دماغ۔ یہ عشق و محبت سے دو چار، وہ دو اور دو چار، اس نے اُسے سمجھانے کی بہتیری کوشش کی کہ:

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے

اُس بے ذوق نے اِس جذبے کو بھی سائنسی انداز میں پرکھنے کی کوشش کی اور اسے ہی چھوڑ گیا۔ سچ ہے:

''احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں حالات''

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس نے اِس کی ابتدائی شاعری میں مذکور ہجر و فراق کو حقیقی رنگ دینے کی کوشش کی ہو اور یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجی ہو کیوں کہ اس کا اپنا مؤقف بھی تو ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ:

یہ دل میسّر و موجود سے بہلتا نہیں
کوئی تو ہو جو مری دسترس سے باہر ہو

اس کی شاعری آسودہ حال لڑکی کی خواہشوں اور غریب عورتوں کی حسرتوں کی تصویر ہے۔ ''خوشبو'' میں ہمیں ایک الھڑ اور چنچل دوشیزہ من مانیاں کرتی نظر آتی ہے۔ ''صد برگ'' میں ایک حسّاس لڑکی کی آسودہ و نا آسودہ خواہشات، ''خود کلامی'' میں سوچ بچار کرتی ہوئی خاتون اور ''انکار'' میں فیصلے صادر کرتی ہوئی عورت نظر آتی ہے۔

اِس دُنیا میں غزل کی وجۂ آغاز عورت اور عورت کی وجۂ آغاز مرد ہے اور اب یہ تینوں

ایک تیسرے کے لیے لازم وملزوم بن چکے ہیں۔اگراُردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین شاعرات کی بھی کمی نہیں مگر ان میں اکثر کے ہاں شاعرہ بولتی ہے تو عورت غائب ہو جاتی ہے اور عورت کی آواز سنائی دیتی ہے تو شاعرہ پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ یہ پہلی خاتون شاعرہ ہے جس کے ہاں عورت اور شاعرہ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

(ڈاکٹر اشفاق احمد ورک۔۔۔خاکہ نگری)

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

پھول شہزادی

محترمہ پروین قادر آغا کوئی باقاعدہ ادیب نہیں ہیں۔اُنھوں نے مذکورہ مضمون یا خاکہ پروین شاکر کی یاد میں منعقدہ کسی پروگرام میں پڑھا تھا جسے ڈاکٹر سلطانہ بخش نے ''پذیرائی'' میں شامل کیا اور خلیل احمد نے ''اُردو کے شاہکار خاکے''، جلد اوّل میں جگہ دی۔اس تعزیتی مضمون کو چونکہ خلیل احمد نے شاہکار خاکوں میں شامل کیا ہے تو ہم اسے خاکہ ہی سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ یہ چند یادوں پر تاثراتی مضمون ہے۔

محترمہ پروین قادر آغا سی۔بی۔آر میں ایک ذمہ دار پوسٹ پر متعیّن تھیں اور یہیں اُن کی پروین شاکر سے پہلی ملاقات ہوئی اور بعدازاں پروین شاکر بھی اسی محکمے اور اسی دفتر میں چلی آئیں اور کوئی سال بھر پروین قادر آغا کے گھر اور بعد میں امریکہ میں اُن کی بہن کے گھر ٹھہریں۔ اِس حوالے سے پروین قادر اُنھیں اپنے گھر کا ہی ایک فرد سمجھتی تھیں۔اور اسلام آباد کے قیام کے دوران جب بھی پروین شاکر کو کچھ مشکل پیش آتی اور اُسے پروین قادر آغا کی مدد کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ ہمیشہ اُس کے ساتھ ہوتی تھیں۔اسی تعلق کی بنیاد پر، پروین قادر آغا نے اپنے مذکورہ مضمون (خاکے) میں پروین شاکر کے ساتھ گزرے لمحوں کو آواز دی ہے اور اپنی ملاقاتوں کو دہرایا اور بڑی محبت سے اُسے یاد کیا۔پروین قادر آغا کا کہنا ہے کہ:

> ''میں پروین کو ایک بڑی شاعرہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عمدہ انسان کی حیثیت سے جانتی ہوں۔''(ص359)

اور اُنھوں نے اسی ''عمدہ انسان'' کا مختصر تعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔جس میں وہ پوری طرح کامیاب نظر آتی ہیں۔

پروین قادر آغا پروین شاکر سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتی ہیں، جب مئی کے ایک گرم دن میں پروین شاکر کراچی سے ایک سرکاری دورے پر اسلام آباد آئی تھیں مگر داخلے کا خصوصی

پاس نہ ہونے کے سبب سی۔ بی۔ آر کے استقبالیہ پر اُنھیں روک لیا گیا تھا اور اُنھیں دفتر کی سیڑھیاں چڑھنے کی اجازت نہ ملی تھی اور وہ اس ''سلوک'' کی وجہ سے مسلسل روئے جا رہی تھیں، اور اِدارے کے چیئرمین کے کہنے پر پروین قادر آغا اُس سے ملنے اور اُسے چُپ کروانے کے لیے آئی تھیں۔ وہ پروین قادر آغا کی پروین شاکر سے پہلی ملاقات تھی۔ مصنّفہ لکھتی ہیں کہ:

> ''جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو میری نظر ایک ''نازک سی'' لڑکی پر پڑی جس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور اُس کی لمبی پلکیں بھی اُس کے آنسوؤں کو مسلسل بہنے سے روک نہیں پا رہی تھیں۔ مجھے اس نازک اور کومل لڑکی سے محبت ہوگئی۔۔۔۔۔۔ اُس کے اندر سے کسی نے مجھے اپنی حفاظت کے لیے پکارا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کا تحفظ میری ذمے داری ہے۔'' (ص359)

اور پھر پروین قادر آغا نے اِس ذمے داری کو عمر بھر نبھایا۔ اور جب پروین شاکر کی کراچی سے اسلام آباد سی۔ بی۔ آر میں ٹرانسفر ہوگئی تو پھر پروین شاکر نے سال بھر مصنّفہ کے ساتھ اُن کے گھر ہی قیام کیا اور یہیں سے اُن کی مستقل گہری قربت کا آغاز ہوا اور یہ تعلق نہ صرف پروین شاکر کی موت تک قائم رہا بلکہ اس کے بعد پروین قادر آغا نے پروین شاکر ٹرسٹ بنا کر اور اُس سے متعلقہ مختلف کتابیں چھاپنے اور مختلف پروگرامز اور سیمینارز کے اہتمام کے ذریعے اسے آج تک قائم رکھا ہوا ہے۔ پروین شاکر اگر عمدہ انسان تھیں تو پروین قادر آغا نے بھی اپنے قول و عمل سے ثابت کیا ہے کہ وہ خود بھی عمدہ ترین انسان ہیں اور محبت بھرے احساسات کا محبت بھرے انداز سے جواب دینے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتی ہیں۔

پروین شاکر نے اپنے آخری شعری مجموعے ''انکار'' کا انتساب پروین قادر آغا کے نام کیا ہے۔ اور اِس سلسلے میں پروین شاکر نے مصنّفہ سے نہ کبھی ذکر کیا تھا اور نہ کبھی اشارتاً ہی یہ بات بتائی تھی۔ اور پھر ایک دن مسکراتے ہوئے پروین شاکر نے اپنی یہ کتاب (''انکار'') مصنّفہ کی طرف بڑھائی اور اُنھوں نے پہلا صفحہ کھولا تو مصنّفہ کے بقول:

> ''میں حیران رہ گئی ۔۔۔۔۔۔۔ اِتنی اعلیٰ ظرفی، اِتنے تھوڑے کے لیے اِتنا

> زیادہ۔میں نے اُس سے محبت کی تھی اور وہ اِس بات کے لیے اتنی ممنونیت کا اظہار کر رہی تھی۔ایک حسّاس روح ہونے کی وجہ سے اُس نے میری محبت اور پیار کی قدر کی اور اس کے اظہار کا یہ طریقہ اپنایا۔'' (ص360)

مصنّفہ نے اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ محبت اور پیار کی قدر دان تھی۔اور یہ اُس کی خاص بات تھی جو اُسے دوسروں سے منفرد اور بلند کرتی تھی۔اور کم عمری میں بے پناہ شہرت، عزت حاصل کر کے بڑی بُرد باری سے اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

مصنّفہ نے اُس کی زندگی کے آخری لمحات کا بھی ذکر کیا ہے جب وہ ''پھول شہزادی'' جا رہی تھی۔مصنّفہ کہتی ہیں کہ

> ''جب وہ میرے پاس آئی تھی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اب جو یہ مجھ سے جدا ہو رہی تھی تو میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔''(ص361)

گو مصنّفہ کو اُس کی موت کا دکھ ہے مگر وہ اِس بات پر مطمئن ہے کہ خدا نے اُسے بڑھاپے کی سختیوں سے بچا لیا۔

> ''اب وہ ہماری یادوں میں ایک تازہ جوان اور خوب صورت پروین شاکر کے طور پر زندہ رہے گی، ایک بے رنگ پھول کی بجائے ایک خوش رنگ پھول کی طرح۔''
>
> (ص361)

وہ ''پھول شہزادی''، رخصت ہوگئی، مصنّفہ جس سے محبت کرتی تھی۔''کیونکہ وہ تھی ہی محبت کے قابل۔کوئی بھی اُس سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔''

مصنّفہ نے اپنے اس مضمون (خاکے) میں اپنی پہلی ملاقات اور اُس کے آخری لمحات کا ذکر کیا ہے اس سے پروین شاکر کی شخصیت کا مکمل تعارف تو نہیں ہوتا مگر مصنّفہ کے جذبات، احساسات اور محبت کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔مصنّفہ اُس کی شخصیت کے حوالے سے کہتی ہے:

> ''ایک مترنم، ایک خوشبو اور حقیقت میں بذاتِ خود ہی شاعری تھی۔مجھے اُس کی شاعری پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، کیونکہ میرے لیے وہ خود ایک نظم تھی۔میں اُسے پڑھتی اور سمجھتی رہی۔''

چونکہ مصنّفہ نے اُس کی ذات کو پڑھا اور سمجھا ہے تو اِسی بنیاد پر وہ لکھتی ہیں کہ:

’’جب وہ ہمارے پاس ہوتی تھی تو پھولوں کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ پورا گھر اُس کی موجودگی اور خوشبو سے لبالب بھر جاتا تھا۔‘‘(ص360)

وہ ایک پھول شہزادی تھی اور مصنّفہ نے بس اسی پھول شہزادی کو محبت بھرے انداز میں یاد کیا ہے اور یہی محبت بھرا انداز اس تحریر کا حُسن اور خوب صورتی ہے اور ساری تحریر خوشبو سے لبالب بھری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

❁❁❁❁❁

پروین قادر آغا

پروین شاکر

اگر میں شاعرہ ہوتی تو پروین شاکر پر ایک نظم لکھتی۔ اگر میں ادیبہ ہوتی تو پروین کی شاعری اور شخصیت کی خوبیاں بیان کرتی اور کچھ تعریفی کلمات کہتی۔ بدقسمتی سے نہ تو میں شاعرہ ہوں اور نہ ادیبہ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہاں جو بہت سے قابلِ ذکر لوگ پروین شاکر کو یاد کرنے کے لیے جمع ہیں، اُن جیسی بھی نہیں ہوں۔ میں پروین کو ایک بڑی شاعرہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عمدہ انسان کی حیثیت سے جانتی ہوں۔

پروین شاکر سے میری پہلی ملاقات آج سے دس سال پہلے میرے دفتر میں ہوئی تھی۔ یہ مئی کا ایک گرم ترین دن تھا اور دفتر کے سب لوگ سالانہ بجٹ کے سلسلے میں بے حد مصروف تھے اور کسی بھی ملاقاتی کو سی بی آر کے دفتر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اچانک اُس وقت کے چیئرمین میرے پاس آئے اور کہا کہ اپنی ایک ہم نام اور کولیگ کو چل کر چپ کراؤ کہ وہ مسلسل روئے جا رہی ہیں۔ اُس وقت، میں نے پروین شاکر کے بارے میں صرف سُن رکھا تھا مگر اُسے کبھی دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس روز اُس کی ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ اُسے سی بی آر کے استقبالیہ پر روک لیا گیا تھا کیونکہ اُس کے پاس داخلے کا خصوصی پاس نہ تھا۔ پروین کے تعارف کرانے کے باوجود اور یہ بتانے کے بعد بھی کہ وہ سرکاری دورے پر کراچی سے آئی ہے اُسے دفتر کی سیڑھیاں چڑھنے کی اجازت نہ ملی تھی۔

جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو میری نظر ایک نازک سی لڑکی پر پڑی جس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور اُس کی لمبی پلکیں بھی اُس کے آنسوؤں کو مسلسل بہنے سے روک نہیں پا رہی تھیں۔ مجھے اس نازک اور کومل سی لڑکی سے محبت ہوگئی۔ اِتنی

خوب صورت آنکھیں رونے کے لیے تو نہیں بنیں۔اُس کی اس وقت کی کیفیت اس کا منی قد کاٹھ، اُس کے نازک احساسات بلکہ اُس کی پوری شخصیت میرے دل میں اُتر گئی۔

اُس کے اندر سے کسی نے مجھے اپنی حفاظت کے لیے پکارا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کا تحفظ میری ذمہ داری ہے۔اس ملاقات میں وہ مجھ سے تفصیل سے بات نہ کر سکی۔میں پروین کی دل جوئی کے لیے اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔جب تک اُس کے آنسو تھمے اُس کا کراچی جانے کا وقت بھی آ گیا۔اُن دِنوں وہ کراچی میں رہتی تھی کیونکہ اُس کی پوسٹنگ بھی وہیں تھی۔ اس کے بعد ہمارا آپس میں کوئی رابطہ نہ ہوسکا۔

اس کے چند ماہ بعد ایک روز میرے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی اور ساتھ ہی ایک روشن اور خوش کُن مسکراہٹ کے ساتھ پروین کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے انتہائی مسرت کے ساتھ کہا ''میری کراچی سے اسلام آباد سی بی آر میں ٹرانسفر ہوگئی ہے'' اور یہاں سے ہماری مستقل گہری قربت کا آغاز ہوا۔

وہ ایک پھول شہزادی تھی۔ایک ترنّم،ایک خوشبو اور حقیقت میں بذاتِ خود ہی شاعری تھی۔مجھے اُس کی شاعری پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ میرے لیے وہ خود ایک نظم تھی۔ میں اُسے پڑھتی اور سمجھتی رہی۔وہ میرے گھر میں میرے ساتھ سال بھر رہی۔اُس نے ایک سال میری بہن کے ساتھ امریکہ میں گزارا۔اس طرح وہ ہمارے گھر کا ہی ایک فرد تھی۔جب وہ ہمارے پاس ہوتی تھی تو پھولوں کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ پورا گھر اُس کی موجودگی اور خوشبو سے لبالب بھر جاتا تھا۔

پروین ایک بے حد حسّاس روح تھی۔وہ کوئی بات کہے یا پوچھے بغیر سب کچھ سمجھ جایا کرتی تھی۔وہ اپنے شعری وجدان کی بدولت انسانوں کی اندرونی کیفیات کو محسوس کرلیا کرتی تھی۔

پروین نے اپنا آخری شعری مجموعہ ''انکار'' میرے نام کیا۔اِس سلسلے میں اُس نے مجھ سے کبھی ذکر نہ کیا تھا اور نہ ہی کوئی اشارہ دیا تھا۔ایک دن میں اُس سے ملنے گئی،اُس نے

مسکراتے ہوئے ایک کتاب میری طرف بڑھائی۔ یہ اُس کا شعری مجموعہ ''انکار'' تھا۔اُس کا پہلا صفحہ کھولا، میں حیران رہ گئی۔محبت بھرے احساسات سے میری آنکھوں میں آنسو آئے، میں اُداس ہوگئی۔ اِتنی اعلیٰ ظرفی۔۔۔۔۔۔اِتنے تھوڑے کے لیے اِتنا زیادہ۔میں نے اُس سے محبت کی تھی کیونکہ وہ تھی ہی محبت کے قابل۔کوئی بھی اُس سے محبت کیسے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور ادھر وہ اِس بات کے لیے ممنونیت کا اظہار کر رہی تھی۔ایک حسّاس روح ہونے کی وجہ سے اُس نے میری محبت اور پیار کی قدر کی اور اس کے اظہار کا یہ طریقہ اپنایا۔

پروین شاکر میں کوئی بات تھی جو اُسے دوسروں سے منفرد اور بلند کرتی تھی۔میں حیران ہوتی تھی کہ اِتنی کم عمری میں اپنی شاعری کی بدولت اُس نے جو شہرت حاصل کی ہے اُسے اس نے کتنی برُدباری سے اپنے اندر جذب کر لیا اور جب ہم نے اُس کی کُلیات ''ماہِ تمام'' شائع کی اُس وقت بھی میں سوچ رہی تھی کہ سب کام کیسے جلدی جلدی ہو رہے ہیں۔ یہ بہت جلدی تھا۔میں اندر سے ڈر گئی۔مجھے حیرت تھی کہ خدا اُس کا ہر کام اِتنی جلدی جلدی کیوں پایۂ تکمیل تک پہنچا رہا ہے۔میرے خدشات درست ثابت ہوئے۔خدا نے اُس کے ذمے جو کام کیے وہ اُنھیں لپیٹ رہا تھا۔میرا خیال ہے خدا بھی اپنی اس تخلیق پروین سے محبت کرتا تھا۔وہ اُسے جلد از جلد جنت میں بلانا چاہتا تھا۔

میں جب ہسپتال میں اُس کے پاس اُس کے جوتے اور پرس ہاتھوں میں لیے کھڑی تھی اُس وقت میں اپنے آپ کو کتنا بے بس محسوس کر رہی تھی، کیونکہ اُس کے پہلے سالوں میں جب بھی اُسے میری ضرورت محسوس ہوتی تھی تو میں ہمیشہ اُس کے ساتھ ہوتی تھی۔لیکن اُس لمحے ہسپتال میں سب بے کار ہوا۔میری پھول شہزادی جا رہی تھی۔میں نے دعا کی لیکن تسبیح کے دانوں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔میں نے محسوس کیا کہ تمام دعائیں بے اثر ہو چکی ہیں کیوں کہ اللہ کی طرف سے دعائیں مستجاب نہیں ہو رہی تھیں۔ یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ جب وہ میرے پاس آئی تھی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اب جو یہ مجھ سے جدا ہو رہی تھی تو میری آنکھیں آنسوؤں

سے لبریز تھیں۔

اب جب میں پیچھے مُڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ آخر خدا نے اُس کی موت کے لیے اس وقت اور طریقے کا انتخاب کیوں کیا؟ وہ ایک غیر معمولی شخصیت تھی، وہ بُڑھاپا لے کر ایک عام موت نہیں مر سکتی تھی۔ اُسے تو ہمیشہ رہنا تھا۔ لہٰذا خدا نے اُس کی بے وقت موت کے لیے ایک ایسے غیر معمولی طریقے کا تعیّن کیا اور اُسے بڑھاپے کی سختیوں سے بچا لیا۔ اب وہ ہماری یادوں میں ایک تازہ جوان اور خوب صورت پروین شاکر کے طور پر زندہ رہے گی۔ ایک بے رنگ پھول کی بجائے ایک خوش رنگ اور تازہ پھول کی طرح۔۔۔۔۔۔ اِس طرح مرنے والے کبھی نہیں مرتے۔

(پروین قادر آغا۔۔۔شاہکار خاکے۔۔مرتبہ خلیل احمد)

❁❁❁❁❁

پروین شاکر

رضیہ فصیح احمد نے لکھا ہے کہ:

''پروین شاکر ایک نرالی شخصیت ،ایک عجیب روح تھی۔۔۔۔۔۔خوش شکل،خوش مزاج،خوش آواز تھی۔ کچھ لوگوں کے نزدیک وہ خوش مزاج نہیں تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔
لوگ کچھ بھی کہیں مجھے تو وہ باتمیز لگتی تھی۔ ہاتھ اُٹھا کر شائستگی سے سلام کرتی تھی اور خیریت پوچھتی تھی۔اُس کے لہجے میں کہیں ''بہاری لہجے'' کی لٹک نہیں تھی بلکہ نہایت صاف شستہ اور نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔'' (ص171-170)

اِن چند جملوں میں رضیہ فصیح احمد نے پروین شاکر کی شخصیت اور مزاج کا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے۔وہ خوش شکل بھی تھی اور خوش مزاج بھی،مگر کچھ لوگوں کے نزدیک وہ خوش مزاج نہیں تھی۔رضیہ فصیح احمد نے لکھا ہے اس کی کچھ وجہ بھی تھی۔کیا وجہ تھی؟ گو موصوفہ نے اس پر کھل کر بات نہیں کی،مگر بین السّطور کچھ اشارے دیے ہیں۔رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں:

''جس دم اسٹیج سے اُتر کر جاتی تھی تو کتنے ہی لوگ جلو میں،بات کرنے کے مشتاق ساتھ ساتھ چلتے تھے۔''(ص171)

اسلام آباد میں اُردو کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں:

''ہوٹل میں سینکڑوں ادیبوں میں ریڈیو اور ٹی۔وی اسٹیشن سے چند لوگوں کا بلاوا آتا تھا،مگر زیادہ تر گاڑیاں پروین کے انتظار میں کھڑی دیکھی گئیں۔فوٹو گرافر اُس کے کمرے کا دروازہ بار بار کھٹکھٹاتے تھے۔''(ص171)

لوگوں کا بات کرنے کے شوق میں ساتھ ساتھ چلنا،ریڈیو،ٹی۔وی سے بلاوے آنا،گاڑیوں کا پروین کے انتظار میں کھڑے ہونا اور فوٹو گرافروں کا بار باراُس کا دروازہ کھٹکھٹانا،کچھ نہ بھی بیان کیا جائے تو خود ہی بہت کچھ بیان کر رہا ہے۔رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں کہ اُس نے اپنی شاعری میں:

''اپنے اور نوخیز لڑکیوں کے جذبات کی عکاسی کی اور اِس قسم کے اشعار کہے جو بہت سی لڑکیاں محسوس کرتی ہوں گی مگر کہہ نہ پاتی ہوں گی۔'' (ص174)

رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں کہ ایک روز میں نے پوچھ ہی لیا:

''تمھارے بارے میں بعض بڑی باتیں سُننے میں آتی ہیں، وہ کیوں؟'' (ص172)

پروین نے اس کا جواب کچھ یوں دیا:

''رضیہ آپا! آپ نے دیکھ ہی لیا (کانفرنس میں پروین شاکر نے نے اپنی حفاظت کے لیے استدعا کر کے رضیہ کو اپنے کمرے میں بٹھالیا تھا) کس طرح لوگ ہمیں پریشان کرتے ہیں اور ہم اُنھیں کس طرح ٹالتے ہیں مگر کوئی تو ایسا بھی ہوتا ہے جسے ہم اندر بلا لیتے ہیں۔ بس اِسی بات پر ''جل'' کر یہ لوگ طرح طرح کی باتیں پھیلاتے ہیں۔'' (ص172)

رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں:

''مجھے کچھ کچھ اُس کی بات کا یقین ہوگیا۔'' ص172)

یعنی مکمل یقین نہیں ہوا، صرف کچھ کچھ ہوا۔ اصل حقائق جاننے یا بیان کرنے کی مصنّفہ نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ البتہ اُس کی ایک دوست کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''وہ اشارتاً کہہ دیتی ہیں کہ درونِ پردہ تھی کوئی بات۔ کسی ہرجائی کی بے وفائی کے بعد اُس نے اس سے بدلے لیے۔۔۔۔۔ اُس خاتون کا کہنا ہے کہ ''اُس ہستی'' کو نیچا دِکھانے کے لیے ہی پروین مقابلے کے امتحان میں بیٹھی اور کسٹمز میں منتخب ہوئی۔''

(ص175)

اُس ہرجائی کا ذکر تو ہوا، مگر اُس کا نام سامنے نہیں آیا جس سے یہ افسانہ بے رنگ ہی رہا اور مقابلے کے امتحان میں بیٹھ کر کسی کو نیچا دکھانے کا قِصّہ بھی بس نِری سُنی سُنائی باتوں کا ہی اظہار ہے، کوئی مصدّقہ کہانی نہیں ہے۔ ''طلاق'' پروین شاکر کی زندگی کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا، مگر رضیہ فصیح احمد نے اس کا اور پروین کی زندگی پر اس کے اثرات کا ذکر تک نہیں کیا۔ البتہ صرف اِتنا لکھا ہے کہ:

''جانے مجھے کیوں خیال تھا کہ پروین شادی وادی نہیں کرے گی مگر اُس کی شادی کی خبر پھیلی۔''(ص173)

رضیہ فصیح احمد نے اِس بات کی وضاحت تو بالکل نہیں فرمائی کہ اُنھیں یہ خیال کیوں تھا کہ پروین شادی نہیں کرے گی مگر اُس کی موت کے بارے میں یہ انکشاف ضرور کیا ہے کہ:

''آج تک لوگ شک کرتے ہیں کہ اُس کی موت کا سبب قدرتی حادثہ نہیں تھا بلکہ اُسے ''مروایا'' گیا ہے۔کیوں کہ اُس نے اپنے کالموں میں نام لے کر لوگوں کے پردے کھولنے شروع کر دیے تھے۔'' (ص174))

یہ بات حقیقت ہے یا صرف شک،اِس کا تو شاید کبھی بھی پتہ نہ چلے مگر یہ حقیقت ضرور ہے کہ وہ نابغہ لڑکی اِس دنیا سے روٹھ کر چلی گئی۔اور رضیہ فصیح احمد نے اپنے اِس خاکے میں اپنی ملاقاتوں، دوستوں سے سُنی سُنائی باتوں اور جذبات سے لبریز شاعری کی مدد سے عجیب روح اور نرالی شخصیت والی پروین شاکر سے تعارف کروایا ہے جس سے قاری مکمل طور پر مطمئن تو نہیں ہوتا البتہ جان بہت کچھ سکتا ہے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

رضیہ فصیح احمد

پروین شاکر

پروین شاکر ایک نرالی شخصیت، ایک عجیب روح تھی۔ پروین کی پیدائش کا سنہ 1952ء ہے سب سے پہلے میں نے اُسے پاکستان ٹیلی وژن پر دیکھا۔ اُن دِنوں ٹی وی اِتنا مقبول تھا کہ ہر گھر میں پروگرام شروع ہوتے ہی کھولا جاتا تھا اور اختتام تک دیکھا جاتا تھا۔ ایک پروگرام میں پروین شاکر نے جو بہت کم عمر کی سی نظر آتی تھی ایک تیز طرار خاتون بیگم احمد علی سے ''پنگا'' لیا اور یہ چیلنج قبول کیا کہ وہ اُن پر فی البدیہہ نظم کہے گی اور کہہ بھی ڈالی۔

1976ء میں اُس کا مجموعہ ''خوشبو'' چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے وہ شہرت کی سیڑھیوں پر چڑھتی چلی گئی اور اُس بلندی تک پہنچی جو اور کسی شاعرہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ نئی نسل میں اتنی ہی مقبول تھی جتنے احمد فراز۔ اور وجہ بھی کچھ ویسی ہی تھی کہ وہ اپنے اور نوخیز لڑکیوں کے جذبات کی عکاسی بہترین الفاظ اور انوکھے پیرائے میں کرتی تھی۔ کم از کم اُس زمانے میں ہر شاعرہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی:

دھوپ آنکھوں تک آ پہنچی ہے رات گزر گئی جاناں
بھور سمے تک جس نے ہم کو باہم اُلجھائے رکھا تھا
وہ البیلی ریشم ایسی بات گزر گئی جاناں

اِسی کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتی ہے: ''وجود کو جب محبت کا وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا۔ اس کا آہنگ وہی ہے جو موسیقی کا ہے کہ جب تک سارے سُر سچے نہ لگیں گلے میں نور نہیں آتا۔ دل کے سب زخم لَو نہ دیں تو حرف میں روشنی نہیں آتی۔''

ظاہر ہے پروین شاکر تو ٹی وی پر بہت بلائی جاتی تھی۔ کبھی کبھی میرا اور اُس کا ساتھ بھی

ہوا۔ وہ ٹی وی اسٹیشن میں بہت بے تکلّف تھی۔ ریکارڈنگ سے پہلے وہ کمرے میں موجود افسروں اور ہدایت کاروں سے بڑے اعتماد سے بات کرتی رہتی تھی۔ پھر کسی کے اِشارے پر مجھ سے کہتی تھی۔ ''آئیے رضیہ آپا مرمت کروالیں۔'' اور ہم میک اپ درست کروانے اُٹھ جاتے تھے۔ لوگ کچھ بھی کہیں مجھے تو وہ باتمیز لگتی تھی۔ ہاتھ اُٹھا کر شائستگی سے سلام کرتی تھی اور خیریت پوچھتی تھی۔ اُس کے لہجے میں کہیں بہاری لہجے کی لٹک نہیں تھی بلکہ نہایت صاف شُستہ اور نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔

اس پُراعتماد لڑکی کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔ وہ پُراعتماد کیوں نہ ہوتی کہ بہت کم عمری میں انگریزی ادب اور لسانیات میں ایم اے کر چکی تھی اور کالج میں پڑھانے لگی تھی۔ خوش شکل تھی، خوش مزاج تھی، خوش آواز تھی۔ کچھ لوگوں کے نزدیک وہ خوش مزاج نہیں بھی تھی لیکن اس کی بھی کچھ وجہ تھی۔

اسلام آباد کی اُردو کانفرنسوں میں جاتے ہوئے جہاز میں چشمہ لگائے، بغیر کانٹیکٹ لینس کے سادہ سے بالوں میں وہ تھوڑی سی مختلف نظر آتی تھی۔ مگر جب وہ تیار ہو کر نکلتی تھی تو وہ پروین شاکر ہوتی تھی کہ جس دم اسٹیج سے اُتر کر جاتی تھی تو کتنے ہی لوگ جلو میں، بات کرنے کے مشتاق ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ ہوٹل میں سینکڑوں ادیبوں میں ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن سے چند ہی لوگوں کا بلاوا آتا تھا مگر زیادہ تر گاڑیاں پروین کے انتظار میں کھڑی دیکھی گئیں۔ فوٹو گرافر اُس کے کمرے کا دروازہ بار بار کھٹکھٹاتے تھے۔

مجھے اس کا تجربہ اِس طرح ہوا کہ اسی کانفرنس میں پروین شاکر، شاہدہ حسن اور ایک اور لڑکی ایک ہی کمرے میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ پروین ایک دن مجھ سے کہنے لگی لوگ ہم لڑکیوں کو بہت تنگ کرتے ہیں، بار بار دروازے کھٹکھٹاتے ہیں، اگر آپ ہمارے کمرے میں آجائیں تو شاید یہ لوگ آپ کا لحاظ کریں۔ میں راضی ہوگئی کیونکہ مجھے یہ جاننے کا شوق تھا کہ یہ لڑکیاں کیسے رہتی ہیں، آپس میں کیا باتیں کرتی ہیں۔ میری اپنی بیٹیاں نہیں تھیں اور جب میں شادی کے بعد پردیس جھانکنے لگی تو بہنیں چھوٹی تھیں۔ پروین نے ہی لکھا تھا۔ ''دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں

نہیں کھلتیں۔"

میں اُس شام اُن کے کمرے میں آ گئی۔ پروین شاکر رات گئے تک کسی سے فون پر انگریزی میں بات کرتی رہی۔انگریزی کا یہ فائدہ ہے کہ "تم" کہہ کے بات کرو تب بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ مخاطب مرد ہے یا عورت۔اس دوران دو ایک مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور آنے والوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ پروین کمرے میں نہیں ہے،کہیں باہر گئی ہے۔

یہ کمرہ فیملی روم تھا۔سامنے دو پلنگ تھے اور پارٹیشن کے بعد غالباً بچوں کے دو پلنگ تھے۔وہاں ایک مزے دار بات یہ معلوم ہوئی کہ کوئی صاحب پروین اور شاہدہ حسن کا انٹرویو لینے آئے اور جب شاہدہ نے بتایا کہ اُس نے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا ہے اور عبداللہ کالج میں انگریزی کی اُستاد ہے تو وہ صاحب حیران ہوئے اور بولے کہ یہ آپ اپنا ذکر کر رہی ہیں یا مذاق میں پروین شاکر کا بائیو ڈیٹا دُہرا رہی ہیں؟

میں سامنے والے حصے میں پروین کے نزدیک والے بستر پر لیٹی تو میں نے پوچھ ہی لیا کہ تمھارے بارے میں بعض بُری باتیں سُننے میں آتی ہیں،وہ کیوں؟

پروین بولی۔"رضیہ آپا! آپ نے دیکھ ہی لیا کہ کس طرح لوگ ہمیں پریشان کرتے ہیں اور ہم اُنھیں کس کس طرح ٹالتے ہیں،مگر کوئی تو ایسا بھی ہوتا ہے جسے ہم اندر بلا لیتے ہیں بس اِسی بات پر جل کر یہ لوگ طرح طرح کی باتیں پھیلاتے ہیں۔

مجھے کچھ کچھ اُس کی بات کا یقین ہو گیا۔

صبح یہ لڑکیاں اُٹھیں تو اطمینان سے کانفرنس ہال جانے کی تیاریوں میں مشغول ہوئیں۔ لباس پر استری،بالوں میں رولرز،غسل اور آنکھوں میں لینس اور میک اپ وغیرہ۔

میں نے گھڑی دیکھ کر گھبرا کر کہا۔"سُنا نہیں کہ آٹھ بجے کانفرنس کے دروازے بند ہو جائیں گے،پھر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔"

پروین نے ہنس کر اطمینان سے کہا۔"ارے رضیہ آپا! کیا ہمارے بغیر پروگرام شروع

ہوسکتا ہے؟''

مجھے شرم آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ رضیہ فصیح احمد کے بغیر پروگرام یقیناً شروع ہوسکتا ہے مگر پروین شاکر کے بغیر نہیں۔

اُدھر جمیلہ ہاشمی ملیں تو فرمایا۔''تمھیں ''سلسلے'' کے لوگ پوچھ رہے تھے تو میں نے کہا، رضیہ لڑکیوں کی حفاظت کے لیے اُن کے کمرے میں چلی گئی ہے۔اس پر مختار زمن نے کہا۔''وہ لڑکیاں تو رضیہ بے چاری کی بھی حفاظت کرسکتی ہیں۔''

دوسرے دن ہال میں پروین چُپکے سے میرے پاس آئی اور کہا۔''رضیہ آپا! ایک گاڑی کا انتظام ہوگیا ہے، ہم لوگ مری جارہے ہیں، بس میں آپ کو بتارہی ہوں۔''

شام کو اُس نے مجھے وہ ننھے مُنے گرم کپڑے دکھائے جو وہ اپنے بیٹے مراد علی کے لیے لائی تھی۔ ہاں اُس کی شادی کی بات تو رہ ہی گئی، جب اُس نے کہا:۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

اور

وہ کہیں بھی گیا، لَوٹا تو مِرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مِرے ہرجائی کی

تو جانے مجھے کیوں یہ خیال تھا کہ پروین شادی وادی نہیں کرے گی۔ مگر اُس کی شادی کی خبر بھی پھیلی اور اُس کے شعر پر''میں سمندر دیکھتی ہوں، تم کنارہ دیکھنا'' پر یہ پیروڈی بنائی گئی۔''میں کراچی دیکھتی ہوں تم ہزارہ دیکھنا'' کہ پروین کے شوہر ڈاکٹر علی ایبٹ آباد میں رہتے تھے اور پروین کراچی میں۔ ابتدا میں وہ کسٹمز میں کام کرتی رہی، پھر اسلام آباد جا بسایا اور وہیں دسمبر 1994ء کی ایک منحوس صبح کام پر جاتے ہوئے ایک ٹرک کی ٹکّر اُس کی گاڑی سے ہوئی اور اُس نے جانِ شیریں جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

اُس کی بے وقت موت پر خاصا واویلا ہوا۔ آج تک لوگ شک کرتے ہیں کہ اُس کی موت کا سبب قدرتی حادثہ نہیں تھا بلکہ اُسے مروایا گیا ہے۔ اُس نے اپنے کالموں میں نام لے لے کر لوگوں کے پردے کھولنے شروع کر دیے تھے۔ موت کا سبب کچھ بھی ہو بہر حال وہ نابغہ لڑکی ہم سے رُوٹھ کر چلی گئی۔

اِس کم عمری میں بھی اُس کی کتنی کتابیں آئیں۔ ''خوشبو'' کے بعد ''صد برگ''، اس کے بعد ''خود کلامی''، ''انکار''، ''کفِ آئینہ''۔ ''ماہِ تمام'' اُس کی شاعری کا مجموعہ ہے اور کالموں کا مجموعہ ہے ''گوشۂ چشم''۔ کالم بھی نہایت بے باکی سے لکھتی تھی۔

اُس کی غزلوں میں جدت کے ساتھ کلاسیکی رنگ ہے۔ واقعہ کربلا کے اشارے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ آزاد نظم میں بھی بے باکی سے قلم اُٹھایا ہے، نئے تجربے بھی ہیں۔ انگریزی شاعروں سے بھی استفادہ کیا ہے، انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ شاید ثقہ حضرات نے انگریزی الفاظ پر ناک بھوں چڑھائی ہو یا یہ کہہ کر خاموش ہو گئے ہوں گے کہ جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے۔ پروین کی شاعری میں نرم و نازک جذبات، خوب صورت اشاروں اور نئی تشبیہات کے ساتھ ملتے ہیں۔ پھولوں، تتلیوں اور رنگوں کا ذکر کثرت سے ہے اور اِس قسم کے اشعار جو بہت سی لڑکیاں محسوس کرتی ہوں گی مگر کہہ نہ پاتی ہوں گی۔

پروین نے اُردو ادب کا گہرا مطالعہ ضرور کیا ہوگا۔ ہندی سے واقفیت بھی ہوگی جو امیر خسرو کے مصرعے کو کام میں لا کر ''گوری کرت سنگھار'' جیسے خوب صورت گیت لکھ پائی۔ ضیاء محی الدین نے پروین کے نام ایک خط پڑھا جس میں ذکر کیا کہ لندن میں پروین کے کچھ اشعار اُن تک پہنچے تو وہ حیرت کا اظہار کر کے پوچھتے رہے کہ بھئی یہ کس کے اشعار ہیں؟

کچھ خواتین اچھی غزلیں کہہ لیتی ہیں مگر نظمیں کمزور رہ جاتی ہیں۔ کچھ کی نظموں میں زیادہ وزن ہوتا ہے مگر پروین کی زیادہ تر غزلوں اور نظموں کا شمار اچھی شاعری میں ہوسکتا ہے۔

اُس کی ایک دوست جس کے پاس پروین کے خطوط بھی ہیں اور اُن کے بیٹے پر اُس

نے نظم بھی لکھی ہے، اشارتاً کہہ دیتی ہیں کہ درونِ پردہ تھی کوئی بات۔کسی ہرجائی کی بے وفائی کے بعد اس نے اس سے بدلے لیے مگر پروین نے تو اپنے دیباچے میں لکھا تھا۔''جولڑکی بسنت بہار کی نرم ہنسی میں بھیگ چکی ہو، اُسے خزاں سے دُکھ تو ہوسکتا ہے عناد نہیں۔''

ان خاتون کا کہنا ہے کہ اُس ہستی کو نیچا دکھانے کے لیے ہی پروین مقابلے کے امتحان میں بیٹھی اور کسٹمز میں منتخب ہوئی (جو محکمہ اُن بڑے محکموں میں جانا جاتا تھا جو اچھے نمبر لانے والوں کو ملتا تھا۔) پاکستان میں یہ بھی سُننے میں آیا تھا کہ پروین کے لیے مقابلے میں بیٹھنے کی عمر کی قید خاص طور پر بڑھائی گئی تھی۔ واللہ اعلم بالصّواب! پروین اور جیتی تو اور بہت اچھی شاعری کرتی۔ اب بھی اُسے بعض اوقات ایران کی شاعرہ فروغ فرخ زاد سے ملایا جاتا ہے۔ انگلستان کے کئی اچھے رومانوی شاعروں کی طرح اُس نے بھی زیادہ عمر نہیں پائی۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کی بہن نے بھی اُس پر ایک کتاب لکھی ہے اور ابھی پروین پر بہت کچھ لکھا جائے گا۔

میں تو صرف یہ کہوں گی کہ وہ بے حد مقبول شاعرہ تھی۔ میں نے مشاعرے کے بعد باہر نکلتے ہوئے اُس کے جلو میں چلتے ہوئے اُس سے ایک بات کرنے کے شوقین لوگوں کی قطاریں دیکھی ہیں۔

اللہ اُسے اپنی رحمت میں جگہ دے۔ آمین

(رضیہ فصیح احمد۔۔گُل دستے اور گُل دائرے)

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

دُکھی عورت

سرفراز اقبال نے پروین شاکر کو ایک ''دُکھی عورت'' لکھا ہے۔ ایسی دُکھی عورت جو تمام عمر محبت اور اَنا کی جنگ لڑتی رہی۔ خوش بختی اور بدنصیبی اُس کی زندگی میں قدم قدم ساتھ چلتی رہی کہ یہی پروین کا مقدّر تھا۔ سرفراز اقبال کے بقول:

> ''اللہ میاں نے اُسے حُسن، شہرت اور کامرانی سے نوازا، لیکن وہ سدا دُکھی رہی۔ کھوئی کھوئی سی ہرنی کی طرح، اپنوں میں اجنبی کی طرح۔ بہ ظاہر اجنبی کی طرح، لیکن اندر سے اُن باسیوں کے ساتھ رہنے کی خواہش لیے ہوئے۔''
>
> (نسوانی خاکے، ص 91-92)

''محبت اور اَنا کی جنگ، بہ ظاہر اجنبی لیکن اندر سے ساتھ رہنے کی خواہش''، سرفراز اقبال نے اِن دو باتوں کے اندر پروین شاکر کی ساری زندگی کے نشیب و فراز کو بیان کر دیا ہے۔

سرفراز اقبال نے پروین شاکر سے 1978ء میں اپنی پہلی ملاقات کا قصّہ بھی لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ:

> ''اُس کے مینٹل پیس پر اُس کی شادی کی تصویر پڑی تھی، لیکن پروین کی اکیلی دُلہن بنی ہوئی تصویر تھی۔ یہ میرے لیے کچھ اچنبھے کی بات تھی کہ دُولہا غائب ہو۔۔۔۔۔تصویر کے اکیلے پن نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔'' (ص 92)

سرفراز اقبال ایک عورت ہے، وہ عورت کی سائیکی بھی جانتی ہے اور عورت کے دُکھ بھی۔ دُولہا کے بغیر اکیلی دُلہن کی تصویر، تصویر کے اِس اکیلے پن نے سرفراز اقبال کو ''بہت کچھ'' بتا دیا۔ اور یہ بہت کچھ ایک عورت ہی سمجھ سکتی تھی۔ پروین سی۔ ایس۔ ایس کر کے کراچی سے اسلام آباد، کسٹم آفیسر بن کر چلی آئی اور سرفراز اقبال کے بقول ''اسلام آباد والی پروین، کراچی والی پروین سے مختلف تھی۔'' سرفراز اقبال نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے:

> ''ایک تو مشہور شاعرہ اور پھر کسٹم افسر کے تقاضے اُسے لوگوں سے ذرا دُوری پر مجبور

کر دیتے تھے۔ وہ پبلک سے دُور رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔''(ص92)

افسری کے تقاضے اپنی جگہ، مگر اس ''دُوری'' کے اصل اسباب اور تھے۔ سرفراز اقبال نے اُن کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''وہ جھجکی جھجکی، شرمائی شرمائی رہتی تھی۔ وہ جس کی دوست تھی، اُن کو بھی کُھلے دل سے نہیں ملتی تھی۔ لوگوں کو اُس سے یہ گلہ تھا، ہم اس کے ہمسائے ہیں۔ یہ ہمیں گھاس ہی نہیں ڈالتی۔'' (ص93)

جھجک اور شرماہٹ کے ساتھ ساتھ اصل اُس کی زندگی کا سُوناپن تھا۔ سرفراز اقبال لکھتی ہیں:

''وہ اکیلی خاتون اپنے بچے کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ نجانے وہ اِتنی اکیلی کیوں تھی؟''(ص93)

اور سرفراز اقبال نے خود ہی اس کا جواب بھی دیا ہے:

''اَنا کے حصار نے اور شادی کی ناکامی نے اُسے اکیلا کر دیا تھا۔''(ص93)

مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ لوگوں نے اُس کے لیے اور بھی افسانے گھڑے:

''وہ جس سے شادی کرنا چاہتی ہے، اُس شخص کے بچے نہیں مان رہے۔''(ص93)

اِس مقام پر سرفراز اقبال کے اندر کی عورت بھی جاگ اُٹھتی ہے اور اُس کا تانیثی شعور بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ سرفراز اقبال لکھتی ہیں:

''ارے بھئی، مرد کو کوئی روک سکتا ہے، اگر وہ شادی کرنا چاہے، اگر بہانے بنانے ہیں تو دوسری بات ہے۔ یقیناً وہ ''عورت'' سب کچھ سمجھتی ہو گی لیکن اب وہ کیسے کہے۔''

(ص93)

یعنی عورت مرد کو، مرد کے بہانوں کو خوب سمجھتی ہے، مگر پھر بھی مجبور ہے، اپنی بدنامی کے خوف سے کچھ کہے تو کیسے کہے؟ سرفراز اقبال نے یہ ایک بالکل نئی بات کہی ہے جس کا کسی اور مضمون یا خاکہ نگار نے ذکر نہیں کیا کہ پروین شاکر طلاق کے بعد جس شخص سے شادی کی خواہاں تھی وہ پہلے سے شادی شُدہ اور بالغ بچوں کا باپ تھا جو اُسے شادی کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ یہ

نئی کہانی ہے جس کا دوسری گھڑی گئی کہانیوں سے تعلق نہیں ہے۔ اِسے لوگوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہی کہنا چاہیے۔ طلاق کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ پروین دوسری شادی نہیں کرے گی ورنہ اُسے اپنے بیٹے کی تحویل سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اور بیٹے سے دست بردار ہونے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

پروین شاکر نے اپنے بیٹے کی پرورش اور تربیت ہی کو اپنی زندگی کا محور اور مقصد بنا لیا۔ اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اپنی تنہائی کو دُور کرنے کے لیے بقول سرفراز اقبال:

> ''اپنے بیٹے کے لیے، مامتا کی تسکین کی خاطر، وہ اپنے بیٹے پر ضرورت سے زیادہ توجہ دیا کرتی تھی، جو بیٹے کی نشوونما کے لیے بہتر ہو یا نہ ہو، اُس نے اُسے سائیکل بھی چلانے نہ دینا۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ اِس دُنیا کی بے انصافیوں کا خوف، کھو جانے کا خوف اور خوشی کے رُوٹھ جانے کا خوف نہیں تو کیا ہے؟'' (ص93)

اور پھر وہ، یہ سارے خوف بیٹے کی جھولی میں ڈال کر خود اِس دُنیا سے رُخصت ہوگئی۔

سرفراز اقبال نے اپنا یہ خاکہ پروین شاکر کے اِس شعر سے شروع کیا تھا:

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

اور اِسی سچ مگر رُسوائی کی بات پر ختم کیا ہے۔

سرفراز اقبال

دُکھی عورت۔۔۔۔۔۔۔پروین شاکر

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

اور افتخار عارف کی زبانی:

میں اُس سے جھوٹ بھی بولوں، وہ مجھ سے سچ بولے

سچ کہلوانے نے اُس گڑیا سی شاعرہ کو زندگی میں ہی تنہا کر دیا تھا۔ وہ تمام عمر محبت اور اَنا کی جنگ لڑتی رہی۔ نہ جانے وہ کسی ایک جذبے کو بھی پا سکی یا نہیں۔ کئی لوگوں کی خوش بختی اور بدنصیبی قدم قدم ساتھ چلتی ہے۔ بس پروین شاکر کا یہی مقدر تھا۔ اُس نے بہت چھوٹی سی عمر میں شہرت کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ وہ شہرت کے اُس مقام پر تھی جہاں لوگ بہت محنت کے بعد بھی نہیں پہنچتے۔ وہ سی ایس ایس کا امتحان دینے گئی تو اُس سے اُسی کے متعلق سوالات پوچھے گئے۔ اُس نے ایم اے کا امتحان دیا تو اُس کے پرچے میں پروین کی شاعری کے متعلق سوال آیا۔ یقیناً یہ سب باتیں ایک انسان کی اَنا کی تسکین کے لیے کافی ہوتی ہیں۔

لیکن کئی لوگ مطمئن نہیں ہوتے، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کی تمام محرومیوں کو کامیابیوں کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے زندگی بِتا رہے ہوتے ہیں۔ حالاں کہ اللہ میاں نے اُسے حُسن، شہرت، کامرانی سے نوازا، لیکن وہ سدا دُکھی رہی۔ کھوئی کھوئی سی ہرنی کی طرح، اپنوں میں اجنبی کی طرح۔ بہ ظاہر اجنبی کی طرح لیکن اندر سے اِن باسیوں کے ساتھ رہنے کی خواہش لیے ہوئے اپنے دن پورے کر گئی۔ اپنے حصّے کی تمام کامرانیاں چھوٹی سی عمر میں سمیٹ کر دور دیس جا بسی۔

مَیں پروین شاکر سے 1978ء میں کراچی جا کر اُس کے گھر میں ملی تھی۔ مجھے

مظہر الاسلام نے کہا ''تم کراچی جا رہی ہو تو جمیل الدین عالی اور پروین شاکر سے کوئی سی بھی چیز لے آنا۔ نظم، غزل، گیت۔'' عالی کی بیوی طیبہ بیگم نے پروین کو فون کیا کہ ہم دونوں آپ کے پاس کب آئیں۔ پروین نے بڑی محبت سے کہا۔'' آئیے اور میرے ساتھ کھانا کھائیے۔'''' کھانا تو ہم کہیں اور کھائیں گے، ہاں چائے آپ کے ساتھ پئیں گے۔ آپ بھی مہربانی کریں اور کچھ لکھ رکھیں جو میں نے مظہر کو جا کر جنگ کے لیے دینا ہے۔'' خیر ہم دونوں پروین کے گھر گئے، اُس نے بہت پُرتکلّف انتظام کیا ہوا تھا۔ ڈھیروں باتیں ہیں۔ اُس کے مینٹل پیس پر اُس کی شادی کی تصویر پڑی تھی، لیکن پروین کی اکیلی دُلہن بنی ہوئی تصویر تھی۔ یہ میرے لیے کچھ اچنبھے کی بات تھی کہ دولہا غائب ہو۔ مَیں خاموشی سے اُس کی تصویر کو دیکھتی رہی اور تصویر کے اکیلے پن نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ واپسی پر اُس نے مجھے ایک نعت لکھ کر دی۔'' پروین! مَیں یہ نہیں لے کر جاؤں گی۔ آپ تو اِتنی اچھی غزل کی شاعرہ ہیں اور آپ بھی فقیہِ شہر کے محاسبے سے ڈر کر نعت دے رہی ہیں۔''

'' سرفراز پہلے آپ پڑھ تو لیں، پھر بات کریں'' اور واقعی بہت خوب صورت نعت تھی۔ مَیں نے وہ نعت لا کر مظہر کو دے دی۔ بہت دِنوں بعد ایک روز اچانک پروین ہالی ڈے اِن، اسلام آباد میں ملی، میں بہت خوش ہوئی کہ اسلام آباد میں ایک خوب صورت اضافہ ہوا ہے لیکن اب پروین کراچی سے مختلف تھی۔ کراچی کے بعد پروین سی ایس ایس کر کے فارن سروس کے لیے منتخب ہو کر کسٹم میں چلی گئی تھی اور افسر بن گئی تھی۔ ایک تو مشہور شاعرہ اور پھر کسٹم افسر کے تقاضے اُسے لوگوں سے ذرا دُوری پر مجبور کر دیتے تھے۔ وہ پبلک سے دُور رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔

ایک بار احمد فرازؔ کے ساتھ ہم سب نے مل کر ایک ''صبح'' کا اہتمام کیا تھا، کسی صاحب نے غالباً ڈاکٹر افضل اقبال نے کہا۔'' میری اور فرازؔ کی چالیس سالہ رفاقت ۔۔۔۔۔'' میرے منہ سے اچانک نکلا: '' ایں فرازؔ اِتنا بُڈھا تو نہیں ۔۔۔۔۔'' پروین نے اِس فقرے کو حفظ کر لیا، دو تین دفعہ جب اسٹیج پر وہ مضمون پڑھنے کے لیے کھڑی ہوئی تو کہا کرتی تھی۔'' سرفراز اقبال سے ڈرتے

ہوئے فرازؔ کے متعلق یہ کہہ رہی ہوں ۔کیوں کہ سرفراز کو فرازؔ کی عمر کا بہت خیال ہے۔۔۔۔۔؟'' آپ شاید حیران ہوں،اس کے بعد اُس کی فراز سے زیادہ انڈر سٹینڈ نگ ہوگئی تھی ۔وہ فرازؔ کو کہا کرتی ۔''فراز! دوستاروں کی دوستی تو زیادہ خوب صورت ہو سکتی ہے نا؟ دیکھو۔۔۔۔۔۔نا، ہم ایک دوسرے سے اُس کی شہرت سے متاثر ہو کر تو نہیں ملتے نا۔'' پھر مظہرالاسلام سے اُس نے بہت اچھا تعلق نبھایا۔وہ جس کی دوست تھی،اُن کو بھی کھلے دل سے نہیں ملتی تھی۔وہ جھجکی جھجکی ،شرمائی شرمائی رہتی تھی۔لوگوں کو اُس سے یہ گلہ تھا، ہم اُس کے ہمسائے میں ہیں، یہ ہمیں گھاس ہی نہیں ڈالتی۔وہ اکیلی خاتون اپنے بچے کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔نجانے وہ اِتنی اکیلی کیوں تھی۔اَنا کے حصار نے اور شادی کی ناکامی نے اُسے اکیلا کر دیا تھا۔ پھر لوگوں نے اُس کے لیے افسانے بھی گھڑے، وہ جس سے شادی کرنا چاہتی ہے، اُس شخص کے بچے نہیں مان رہے، ارے بھئی مرد کو کوئی روک سکتا ہے، اگر وہ شادی کرنا چاہے۔اگر بہانے بنانے ہیں تو دوسری بات ہے۔یقیناً وہ عورت یہ سب کچھ سمجھتی ہوگی،لیکن اب وہ کیسے کہے۔وہ زندگی سے چند لمحے جو اُسے جس طرح بھی ملیں، بلا سے فریب کے پیکٹ میں خوب صورت طریقے سے لپٹے ہوئے الفاظ کے روپ میں ملیں۔وہ اُن میں جیا کرتی تھی۔اپنے بیٹے کے لیے، مامتا کی تسکین کی خاطر،وہ اپنے بیٹے پر ضرورت سے زیادہ توجہ دیا کرتی تھی جو بیٹے کی نشوونما کے لیے بہتر ہو یا نہ ہو۔اُس نے اُس کو سائیکل بھی نہیں چلانے دینا، یہ سب کیا ہے، یہ اس دُنیا کی بے انصافیوں کا خوف،کھو جانے کا خوف،اور خوشی کے روٹھ جانے کا خوف نہیں تو کیا ہے؟ حالاں کہ خوف تو وہ سب دوستوں اور بیٹے کی جھولی میں ڈال کر خود اُس دُنیا میں چلی گئی ہے،جہاں سُکھ ہی سُکھ ہے لیکن کبھی کبھی میں اُداس ہو کر سوچتی ہوں، وہ وہاں بھی کیسے سکھی ہوگی۔اُس کی مامتا تو پریشان ہوگی،اور محبت کی ناکامیوں کا دُکھ اُسے ضرور دُکھی ہی کرتا ہوگا:

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

(سرفراز اقبال۔۔۔نسوانی خاکے)

❁❁❁❁❁

میری پروین

محترمہ عرفانہ عزیز، پروین شاکر کی اُستاد تھیں اور اُن کا دعویٰ ہے کہ ''پروین شاکر میری دریافت ہے اور اُس کے جوہر کو نمو کی دعوت میں نے دی ہے۔'' وہ لکھتی ہیں:

''پروین سرسیّد کالج کی مقبول ترین طالبہ تھی۔ وہ بے پناہ صلاحیتیں رکھتی تھی اور اُس کا مطالعہ ہمیشہ وسیع رہا۔ ایک مرتبہ میں نے پروین سے کہا کہ ''وجدانی طور پر مجھے معلوم ہے کہ تم شعر کہنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ تمھارا ادبی ذوق ستھرا ہے۔''

اُسی زمانے میں کالج میگزین شائع ہونے والا تھا اور محترمہ عرفانہ عزیز کی خواہش تھی کہ پروین شاکر میگزین کے لیے چھ ستمبر کے حوالے سے نظم لکھے۔ نظم ہوگئی تو محترمہ عرفانہ عزیز نے اُس کی نوک پلک درست کی۔ یہ پروین شاکر کی پہلی نظم تھی۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ پہلے وہ کالج کے مشاعروں میں حصّہ لیتی رہی، پھر مختلف کالجوں اور یونیورسٹی کے مشاعروں میں شرکت شروع کر دی۔ مگر ابھی تک شعری رموز سے واقف نہیں تھی، اور اُسے وزن اور بحروں سے آشنائی نہیں تھی۔ وہ غزلیں لکھتی تھی اور محترمہ عرفانہ عزیز اِصلاح دیتی تھیں۔ محترمہ عرفانہ عزیز نے گُلِ رعنا کلب کے ایک مشاعرے کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے جس میں پروین شاکر نے عرفانہ عزیز کے مشورے سے مختلف فارسی تراکیب کو ملا جلا کر نظم لکھ کر پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ محترمہ کا کہنا ہے کہ:

''میں نے اُسے چند برس ہی اصلاح دی۔ پھر میں کینیڈا جا بسی اور وہ احمد ندیم قاسمی کی نگہداری میں فنّی ترقی کے مدارج طے کرتی رہی۔ مگر پروین شاکر ہمیشہ یہ اعتراف کرتی رہی کہ ''میں جو کچھ ہوں آپ کی وجہ سے ہوں۔''

محترمہ عرفانہ عزیز کے پروین شاکر کی ابتدائی شاعری کے ساتھ ساتھ اُس کے ایک ابتدائی عشق کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُس وقت کا عشق جب پروین کی عمر ابھی سولہ برس تھی اور وہ ابھی

ایف۔اے کی طالبہ تھی اور اشک گرفتہ ایک شام اُن سے ملنے آئی تھی۔عرفانہ عزیز لکھتی ہیں:

''میں نے کہا:''کیا بات ہے؟''

''مس، میں ایک جذباتی حادثے سے دوچار ہوں۔''

''تم اپنی توجہ فی الحال تعلیم اور شعر و سخن پر رکھو۔''

''مس وہ مجھے خدا کا درجہ دیتا ہے۔''

''محبت ایک انتہائی خوب صورت جذبہ ہے پروین! لیکن ہمارا زُود رنج معاشرہ ایسی بغاوت کو پسند نہیں کرتا۔اگر دل کی تہذیب کی حدود میں تم اِس معصوم سی چاہت کی پرورش کر سکتی ہو تو میں تمھارے ساتھ ہوں، لیکن تمھارے والدین اِسے گوارا نہیں کریں گے۔تمھاری نسبت طے ہے۔''میں نے کہا۔

''میں یہ تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔''

محترمہ عرفانہ عزیز نے مزید لکھا ہے:

''غالباً میرے سِوا اُس کی پہلی چاہت کو کوئی نہیں جانتا۔پروین کی یہ پہلی محبت تھی۔ تب وہ سولہ برس کی تھی۔اس کے بعد پروین کے ذوقِ محبت نے کیا مرحلہ طے کیے، مجھے نہیں معلوم۔''

محترمہ عرفانہ عزیز کا یہ بھی کہنا ہے کہ میں نے اُس کے محبوب کو دیکھا تھا۔وہ لکھتی ہیں:

''ذہین اور بانکا تھا۔ بہت جوشیلا، چڑھتے دریا کی طرح، لہجہ وادیوں میں گونجتے ہوئے آبشاروں کی طرح۔''

بس اِتنا سا ذکر ہے۔مگر وہ ذاتِ شریف کون ہے؟ اِس کی کوئی خبر نہیں۔پروین شاکر کا یہ تجربہ کیسا رہا؟ اس عشق یا چاہت کا انجام کیا ہوا؟

پروین ابھی سولہ برس کی الھڑ اور نادان لڑکی ہے۔مانا کہ وہ ایک جذباتی حادثے سے دوچار ہوگئی ہے اور اُس نے عرفانہ عزیز صاحبہ کو اپنی ایک ہمدرد اور محسن سمجھ کر اُن سے رازِ دل کہہ دیا ہے۔محترمہ عرفانہ عزیز صاحبہ نے اُسے جو نصیحت یا دل جوئی کی وہ اپنی جگہ، مگر اِس عمل کی تشہیر کرنا بھی ضروری سمجھا۔اب اِسے کیا کہا جائے؟ یہ پروین کی شہرت ہے یا رُسوائی ہے؟ عرفانہ

عزیز جو پروین کو اپنی ایکسٹینشن قرار دیتی ہیں، وہی بہتر بتا سکتی ہیں۔

عرفان جاوید صاحب نے پروین شاکر کے اس لڑکپن کے یعنی سولھویں برس کے پہلے عشق کو ''مجنونانہ عشق'' قرار دیا ہے، مگر اِس بارے کوئی تفصیل نہیں، بلکہ اس کے بعد کے ایک اور عشق کو سچی محبت کہا ہے۔

محترمہ عرفانہ عزیز نے اِس تجربے کے حوالے سے یہ تحریر فرمایا ہے:

''اور پھر ''خوشبو'' وجود میں آ گئی، قریہ قریہ کُو بہ کُو پھیل گئی۔''

پہلا عشق یا تجربہ سولھویں برس کی واردات ہے یعنی 1968ء کا قصّہ، جب ابھی پروین کو شاعری کے اوزان یا بحروں سے بھی آشنائی نہیں تھی۔ ''خوشبو'' 1977ء میں چھپی جب پروین کی شادی کو بھی ایک برس گزر چکا تھا اور دوسرے عشق کے ڈپریشن سے بھی نجات مل چکی تھی۔ اگلا سوال یہ ہے، کیا شاعری واقعی شاعر یا شاعرہ کی اپنی ہی آپ بیتی ہوتی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ ''خوشبو'' کی شاعری ایک ناتجربہ کار دوشیزہ کے جذبات کی عکاسی ہے، مگر یہ کوئی آپ بیتی نہیں ہے۔ یہ اُس کے بیتے دِنوں کی گواہی نہیں بلکہ ہمارے سماج کے گُھٹن زدہ ماحول اور اُس میں پلنے والی مجبور لڑکیوں کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ ہر اُس معصوم لڑکی کی کہانی ہے جو رواجوں کے آہنی حصار میں عمر قید کاٹ رہی ہے۔ ٹھیک ہے شاعری میں شاعر یا شاعرہ کے اپنے جذبات واحساسات بھی ہوتے ہیں مگر اِس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے عہد اور سماج کا بھی ترجمان ہوتا ہے۔ شاعری گرد وپیش کے ماحول کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اور ''خوشبو'' کی شاعری ان ہی جذبات واحساسات اور ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اِسے صرف آپ بیتی کہنا انتہائی زیادتی ہے۔

مضمون کے آخر میں محترمہ عرفانہ عزیز نے پروین کو اپنی ایکسٹینشن قرار دیتے ہوئے، دونوں کے درمیان جو ذہنی مفاہمت تھی اُس کا ذکر کیا ہے اور اس کی الم ناک موت اور اپنے دُکھ اور غم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

’’جسے میں نے زندگی کی طرح چاہا اُس کا مدفن دیکھنے کا حوصلہ نہیں۔‘‘

یہ مضمون پروین شاکر کی ابتدائی شاعری، ابتدائی چاہت کی کہانی سنانے کے بعد اُس کی موت اور مصنّفہ کے غم انگیز بیان پر ختم ہو جاتا ہے اور قاری بھی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ مصنّفہ کے کاسۂ دل میں اب ایک مسلا ہوا پھول ہے اور بس۔

مگر پروین جو اُس سے رازِ دل کہہ بیٹھی تھی، اُس کا چرچا اب بھی چارسُو ہے۔

عرفانہ عزیز

میری پروین

پروین میری عزیز ترین شاگرد تھی۔ عقل و دانش کا پیکر، ذہانت و فطانت میں یکتا، آداب اور شائستگی کی تصویر، میں نے پروین کو دریافت کیا تھا۔ اُس کے جوہر کو دعوتِ نمو دی تھی۔ جس پودے کو خونِ جگر سے سینچا تھا معلوم نہ تھا کہ وہ اپنے لہو میں ڈوبے گا۔

پروین سرسیّد کالج کی مقبول ترین طالبہ تھی۔ وہ بے پناہ صلاحیتیں رکھتی تھی اور اُس کا مطالعہ ہمیشہ وسیع رہا۔ ایک مرتبہ میں نے پروین سے کہا کہ وجدانی طور پر مجھے معلوم ہے کہ تم شعر کہنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ تمھارا ادبی ذوق سُتھرا ہے۔ اُس زمانے میں کالج میگزین شائع ہو رہا تھا اور میں چاہتی تھی کہ وہ چھ ستمبر پر نظم کہے۔ نظم ہوگئی، میں نے نوک پلک درست کی۔ یہ پروین کی پہلی نظم تھی۔ پھر پروین کے شعر وسخن میں تسلسل آتا گیا۔ پہلے وہ کالج کے مشاعروں میں حصّہ لیتی رہی، پھر مختلف کالجوں اور یونیورسٹی کے مشاعروں میں اُس نے شرکت کی۔ ایک مرتبہ گُل رعنا کلب میں مشاعرہ تھا۔ اہتمام یوتھ سیکشن نے کیا تھا۔ مقابلے میں مختلف کالجوں نے حصّہ لیا تھا۔ یہ مقابلہ اہم تھا۔ مجھے ہر صورت میں پروین کو اوّل انعام دلانا تھا۔ میں نے پروین سے کہا ''غزل کے مقابلے میں حصّہ نہ لینا کیونکہ ابھی تم وزن، بحروں سے آشنا نہیں ہو۔ ابتدا میں اُس کی غزلوں پر جب میں اصلاح دیتی تھی تو ری رائٹ کرتی تھی لیکن اِس مقابلے میں سخن وروں کو طبع آزمائی کے لیے محدود وقت دیا گیا تھا اور اُنھیں نظم یا غزل اس محدود وقت ہی میں کہنا تھا اور اصلاح دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پروین نے میرے مشورے کے مطابق نظم میں طبع آزمائی کی، میں نے پروین شاکر سے کہا کہ نظم میں ابلاغ ہونا تو ضروری ہے لیکن شعر میں ذرا ابہام رکھو۔ مقابلے سے پہلے میں نے اُسے بہت سی فارسی تراکیب ذہن نشین کروا دیں کیونکہ انعام جیتنے کے لیے میں چاہتی تھی کہ اُس کا ڈکشن منفرد ہو جو منصفین کو اُس کی ذہانت کا قائل کردے۔

پروین نے نظم کہی اور مقابلے میں اوّل انعام ملا تو ہم دیر تک ہنستے رہے۔ پروین

نے اپنی بے پناہ ذہانت سے کام لیتے ہوئے فارسی ترکیبیں بڑے سلیقے سے استعمال کی تھیں۔اُس زمانے میں وہ سیکھ رہی تھی۔اُس کا اُسلوب واضح طور پر نہیں اُبھر رہا تھا۔اُس کی عمر پندرہ سولہ برس تھی اور اُس وقت اُس سے بڑی توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتی تھیں۔حال ہی میں جو ادیبوں، دانش وروں کی کانفرنس اسلام آباد میں ہوئی تھی، پروین مجھے بائیس سال بعد ملی۔میں نے کہا کہ" تمھیں "گل رعنا" کلب کا مشاعرہ یاد ہے؟ اوّل انعام جیتنے کے لیے ہم نے کیا ہوشیاری کی تھی۔" وہ دیر تک ہنستی رہی۔پھر وہ شبنم شکیل سے کچھ کہنے لگی۔غالباً وہ میرا ذکر ہر کسی سے کرتی تھی۔ پروین مجھے جتنی پیاری تھی اُسے بھی مجھ سے اُتنی ہی عقیدت تھی۔ پروین میں کربِ تخلیق کی فراوانی تھی، اِس لیے میں نے اُسے صرف چند برس ہی اصلاح دی۔پھر میں کینیڈا جا بسی اور احمد ندیم قاسمی کی نگہداری میں وہ فنی ترقی کے مدارج طے کرتی رہی۔

ترکِ وطن کے چند سالوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ پروین فکر وفن اور شہرت کی انتہائی بلندیوں کو چُھو چکی ہے۔وہ چاہتی تو اپنی راہ میں میرے کسی نقشِ قدم کو شمار نہ کرتی۔اُس نے اگر کبھی میری ذات کا حوالہ دینا مناسب سمجھا تو یہ اُس کی اپنی وضع داری تھی۔اسلوب اُس کا اپنا اور منفرد تھا۔

وہ اُداس سی سردیوں کی شام بھی یاد آتی ہے جب پروین گوشۂ چشم میں اشکِ گرفتہ لیے گھر مجھ سے ملنے آئی۔میں نے کہا "کیا بات ہے؟" "مس! میں ایک جذباتی حادثے سے دوچار ہوں۔" "تم اپنی توجہ فی الحال تعلیم اور شعر وسخن پر رکھو۔" "مس وہ مجھے خدا کا درجہ دیتا ہے۔" "محبت ایک انتہائی خوب صورت جذبہ ہے پروین! لیکن ہمارا زود رنج معاشرہ ایسی بغاوت کو پسند نہیں کرتا۔اگر دل کی تہذیب کی حدود میں تم اِس معصوم سی چاہت کی پرورش کرسکتی ہو تو میں تمھارے ساتھ ہوں لیکن تمھارے والدین اِسے گوارہ نہیں کریں گے۔تمھاری نسبت طے ہے۔" میں نے کہا۔

"میں یہ تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔"

اور پھر ''خوشبو'' وجود میں آ گئی، قریہ قریہ، کو بہ کو پھیل گئی۔ میں نے اُس کے محبوب کو دیکھا تھا، ذہین اور بانکا تھا، بہت جوشیلا چڑھتے دریا کی طرح۔ پروین کی یہ پہلی محبت تھی۔ تب وہ سولہ برس کی تھی۔ اس کے بعد پروین کے ذوقِ محبت نے کیا مرحلے طے کیے، مجھے نہیں معلوم۔ کیونکہ میں ترکِ وطن کر چکی تھی۔ پروین کئی کتابیں پڑھتی رہتی تھی۔ جب بائیس سال کینیڈا میں رہنے کے بعد میں وطن واپس لوٹ آئی تو پروین سے ملاقات اسلام آباد میں ہوئی۔ وہ مجھے ویسی ہی لگی جیسی وہ بائیس برس پہلے تھی۔ دھان پان سی، خوب صورت، نفیس، نازک سی، سراپا جمال۔ میں نے پروین سے کہا ''پروین مجھے تم پر فخر ہے۔''

''میں آج جو کچھ بھی ہوں، آپ کی وجہ سے ہوں۔'' اُس نے انکسار سے کہا۔

''نہیں، تم اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی بنیاد پر آگے بڑھی ہو، میں نے تمھاری راہوں میں اگر چراغ جلائے تو اپنی روشنی کی منزل بھی سامنے تھی۔'' میں نے کہا۔ پروین میری روح، میرے ذہن، میری ذات کا ایکسٹینشن تھی۔ کسی بھی اُستاد اور شاگرد کے درمیان ذہنی مفاہمت اور وجدان و اشراق کا وہ رشتہ نہیں ہوتا جو میرے اور پروین کے درمیان تھا۔ غالباً میرے سوا اُس کی پہلی چاہت کو کوئی نہیں جانتا اور غالباً پروین کے سوا اس حصار میں کوئی داخل نہیں ہوا جو میں نے اپنی ذات کے گرد کھینچا ہوا تھا۔ جسے میں نے زندگی کی طرح چاہا اُس کا مدفن دیکھنے کا حوصلہ نہیں۔ آج سے دو برس پہلے جب ریاض کی تربت پر پھول رکھے تھے تو سوچا تھا کہ میری ذات کا نصف حصّہ مدفون ہے اور نصف حصّہ خوشبو کی صورت میں زندہ ہے لیکن اب کاسۂ دل میں ایک مسلا ہوا پھول ہے جس میں میری پہچان بھی تھی۔ اب زندگی نیستی کی دشت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

(عرفانہ عزیز۔۔۔۔روزنامہ جنگ، 2 جنوری 1995ء)

❁❁❁❁❁

پارو

''سُرخاب'' میں شامل تذکرہ نما مضمون پہلے روز نامہ ''جنگ'' لاہور کے سنڈے ایڈیشن میں چار قسطوں میں شائع ہوا۔ پہلی قسط 15 اکتوبر 2017ء کو صفحہ نمبر 19 پر چھپی۔ دوسری قسط 22 اکتوبر 2017ء کو صفحہ 9 پر، تیسری قسط 29 اکتوبر 2017ء کو صفحہ 11 پر اور آخری (چوتھی) قسط 5 نومبر 2017ء، صفحہ نمبر 10 پر شائع ہوئی۔

عرفان جاوید نے لکھا ہے کہ پروین، بانو، بینا، پارہ، پارو ایک ہی لڑکی کے نام ہیں۔

عرفان جاوید کہتے ہیں:

> ''پارہ صفت پیاری سی پروین کو بچپن میں محبت سے ''پارو'' کہا جاتا تھا۔ بعد میں کالج کی تعلیم کے دوران شاعری کے ابتدائی دِنوں میں اُس نے اپنا تخلّص ''بینا'' رکھا تھا۔''(1)

عرفان جاوید صاحب نے اپنے اِس خاکہ نما مضمون میں پروین شاکر کی پیدائش اور بچپن سے لے کر اُس کی موت تک کے اہم واقعات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ پروین کے والدین کا تعلق صوبہ بہار کے شہر پٹنہ سے تھا۔ مگر اُن کے والد قیامِ پاکستان سے دو برس قبل کراچی کی بستی چاکی واڑہ میں آ کر قیام پذیر ہوئے۔ محکمہ ٹیلی فون، ٹیلی گراف میں بہ طور کلرک نوکری کی۔ پروین کے والد شاکر حسین کی 1949ء میں افضل النّساء سے شادی ہوئی اور پروین 24 نومبر 1952ء کو کراچی کے لیڈی ڈفرن اسپتال میں پیدا ہوئی۔

عرفان جاوید بتاتے ہیں:

ننھی پروین لااُبالی طبیعت کی بچی تھی جو اپنی چیزیں اکثر گُم کر آتی۔ باقاعدگی سے مجالس میں جاتی اور چپل اُتار کر بھول آتی۔ گھر میں مرغی، خرگوش، بلی اور بکری جیسے جانور پال رکھے تھے اور بڑے انہماک سے اُن کا خیال رکھنے میں مصروف رہتی۔ اور اگر اُس کا کوئی جانور

مر جاتا تو رو رو کر بُرا حال کر لیتی اور باقاعدہ قبر بنا کر اُس کو دفن کرتی۔ پروین کو گڑیا سے کھیلنے کا شوق نہ تھا۔ البتہ درختوں پر چڑھنا، اُن سے پھل توڑ کر کھانا اور کھیل کُود پسند تھے۔

حسن عسکری عظیم آبادی پروین کی نانی کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ علم و ادب کا شُستہ ذوق رکھتے تھے۔ پروین اور اُس کی بڑی بہن نسرین کی علمی و شعری تربیت کر کے اُن کی زبان صاف کر دی اور اُنھوں نے شعر کے شغف اور فہم سے دونوں کے وجود معطّر کر دیے۔

پروین نے ابتدائی تعلیم رائزنگ سن سکول اور رضویہ گرلز اسکول سے حاصل کی اور بعد میں سر سیّد کالج سے انٹر 1968ء اور بی۔اے 1971ء میں کیا۔ اور یہیں اُسے عرفانہ عزیز ایسی مشفق معلّمہ کی راہ نمائی میسر آئی۔ اُنھی دِنوں کی بات ہے کہ پروین محبت کے لطیف گلابی تجربے سے گزری۔ عرفان جاوید نے پروین کے لڑکپن کے سولھویں برس کے پہلے عشق کو مجنونانہ عشق قرار دیا ہے اور اس کے بعد دوسری محبت کو سچی محبت قرار دیا ہے، مگر عرفان جاوید صاحب یہاں تھوڑے سے کنفیوز ہوئے ہیں اور مجنونانہ عشق اور دوسری سچی محبت کو گڈ مڈ کر گئے ہیں۔ اُن کی تحریر سے یوں لگتا ہے کہ جیسے ''مجنونانہ عشق'' اور ''سچی محبت'' ایک ہی واردات ہو۔ بہر حال ان دونوں کا ملا جلا کر عرفان جاوید صاحب نے اس لطیف گلابی جذبے کی کہانی بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''وہ پولیس میں سرکاری عہدے پر متمکن تھا اور یہ طالبہ تھی۔ یہ جذبات میں سچی اور وہ وعدوں کا پاس دار تھا۔۔۔۔۔ وہ کچی امبی کی کھٹی کنواری مہک لیے ہوئے تھی اور اُس کا محبوب اُس کے بقول برسات کی خوشبو کے مانند تھا۔۔۔۔ وہ ذہین، خُوب رُو، باوقار، برسرِ روزگار اور اس سے محبت کرنے والا تھا۔ دونوں کی جوڑی خوب سجتی تھی۔ لڑکے نے اپنے اہلِ خانہ کو رِشتے کے لیے پروین کے ہاں بھیجا۔''(2)

کہانی میں آگے بڑھنے سے پہلے تھوڑا سا اِدھر اُدھر بھی دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اُس (پروین) کی بزم سے ہر کوئی الگ الگ کہانی لے کر آیا ہے۔

عرفان جاوید صاحب نے سولھویں سال کے پہلے عشق کو مجنونانہ عشق کا نام دیا اور دوسری محبت کو سچی محبت قرار دیا۔ گو دونوں کو رلا ملا دیا مگر پروین کے محبوب کی بڑی تعریف کی ہے۔ ذہین، خوب رُو، باوقار، برسرِ روزگار، محبت کرنے والا۔ مگر عالیہ جلیل شاہ اور احمد پراچہ صاحب کے بیانات کوئی اور کہانی سُناتے ہیں۔

عالیہ جلیل شاہ کا کہنا ہے کہ:

''پروین شاکر اپنی ذات کی تمام سچائیوں سمیت اُس کی محبت میں سنجیدہ تھیں، جب کہ لڑکے کا مزاج مختلف تھا۔ وہ اُس کی محبت میں سنجیدہ نہ تھا۔''(3)

اور احمد پراچہ صاحب کہتے ہیں:

''وہ لڑکا شادی کی طرف مائل نہیں ہو رہا تھا۔ اُس لڑکے کی آرزو اور اُمنگ بہتر کیریئر تھا۔۔۔۔۔ اُسے احساس تھا کہ ایسی شادی اُسے بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے معاون اور مددگار نہیں ہوگی۔''(4)

اِن اقتباسات سے تو یہ تأثر ملتا ہے کہ وہ لڑکا محبت میں سنجیدہ نہیں تھا اور اِتنا کم ظرف اور خودغرض تھا کہ شادی جیسے مقدّس بندھن کو بھی کوئی کاروبار اور زندگی میں بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے معاون اور مددگار سمجھتا ہے۔ اس سارے واقعہ کو نجمہ خانم ملک یوں بیان کرتی ہیں:

''کراچی یونیورسٹی کے زمانے میں، وہ ایک شخص جو پروین کی زندگی اور سوچ کا انقلابی ہوا، آج کراچی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور ملک وقوم کی خدمت سچائی اور دیانت داری سے کر رہا ہے۔ پروین کیونکہ بے حد جذباتی اور ضدی واقع ہوئی تھی، اِسی لیے اُنھوں نے اپنا آئیڈیل سمجھ کر مستقبل کا خواب اُنھی سے وابستہ کرلیا تھا لیکن تقدیر کے فیصلے اُوپر والا کرتا ہے۔ پروین کی خواہش پر جب وہ اور اُن کے گھر والے ملنے آئے تو یقیناً ایک لاجواب انتخاب تھا۔ کہیں کوئی کمی نہ تھی، صرف اور صرف فرقوں کا فرق، جس نے ممکن کو ناممکن بنا دیا۔ اُن کی اعلیٰ ظرفی اور شرافت اور کردار کی عظمت نے اس گھرانے پر کبھی حرف نہ آنے دیا اور ہمیشہ اس گھر کی دُعائیں اور نیک تمنائیں، اعلیٰ قدر جذبہ، اُن کے اور اُن کے گھر والوں کے

مرہونِ منت رہے گا اور ہمیشہ اُن کی بیوی اور وہ خود پُرخلوص فراخ دلی، انکساری اور جذبۂ انسانیت کے گراں قدر جذبات کے ساتھ اس خاندان کے کام آنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔'' (5)

عالیہ جلیل شاہ جسے ہرجائی اور عام گھر کی لڑکی سے شادی کرنے سے گریزاں کہتی ہے اور احمد پراچہ جو اُس کے حوالے سے کہتا ہے کہ وہ شادی کو بھی کاروبار یا کیریئر کی بہتری کا زینہ سمجھتا تھا، نجمہ خانم ملک اُس کی شرافت، کردار کی عظمت اور اُس کی اعلیٰ ظرفی کی تعریف کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ اُس کی بیوی بھی پُرخلوص، فراخ دلی، انکساری اور انسانیت کے گراں قدر جذبے کے تحت، اس خاندان کے کام آنے کے لیے اب بھی بے چین رہتے ہیں۔

بہرحال پروین شاکر کے مجبور کرنے پر اپنے اہلِ خانہ کو رشتے کے لیے بھیجتا ہے۔ اور آگے کہانی ایک جیسی ہے کہ:

''پروین کے والد رشتہ دیکھ کر بھڑک اُٹھے۔ پروین کی یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اپنے لیے رشتہ خود تلاش کر لے اور لڑکا بھی سُنّی۔ یہ کٹر شیعہ تھے۔ سو دوٹوک انکار ہو گیا۔'' (6)

گو پروین نے باپ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا مگر:

''اِس اِنکار نے پروین میں کونین کی گولی کی سی کڑواہٹ بھر کر اُس کے اندر سلگتے سرکشی کے الاؤ کو ہوا دی۔۔۔۔ گھر والوں کے انکار نے پروین کو نفسیاتی اضمحلال سے دوچار کر دیا۔ نازک، جذباتی لڑکی تھی، قلبی سانحات سہہ نہ پائی اور اُسے چند ایک بار بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔'' (7)

اب پروین شاکر کی زندگی میں ایک نیا کردار داخل ہوتا ہے۔ پروین کی والدہ کی ماموں زاد بہن کا بیٹا ڈاکٹر نصیر علی، جسے پروین کی بیماری کے دوران مشورے کے لیے اکثر بلایا جاتا ہے اور بقول عرفان جاوید صاحب، بہ ظاہر تو اِس خاندان کے پروین کے خاندان سے خاصے خوش گوار تعلقات تھے، مگر مزاج مختلف تھے۔ مگر ڈاکٹر نصیر علی کے دل میں پروین کو

اپنانے کی خواہش اُبھری اور اُس نے اِس کا بڑے اصرار سے اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر نصیر علی کی والدہ ایک سخت مزاج روایتی خاتون تھیں جو اپنے بیٹے کے لیے امیر خاندان سے دُلہن لانا چاہتی تھیں۔ اور پروین، وہ تو ایک شاعرہ تھی، معلّمہ تھی، معروف تھی، خوش شکل تھی۔ مگر نصیر کی والدہ کی خواہشات کے مطابق نہ تھی۔ نصیر کا اصرار بڑھا تو طوعاً و کرہاً اہلِ خانہ نے آمادگی ظاہر کر دی۔ اِس رِشتے پر پروین کی والدہ کو بھی کچھ تحفّظات تھے۔ اُنھیں اِس خاندان میں بناوٹ اور گُھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ اِس لیے آمادگی سامنے آنے پر اُن کے دل میں وسوسے کیکڑوں کی طرح پنجے جمانے لگے۔ عرفان جاوید صاحب مزید لکھتے ہیں، شادی کے معاملات بڑھے تو پروین کے وساوس میں بھی اضافہ ہوا۔ یہاں اُسے اپنے عمّو احمد ندیم قاسمی کا خیال آیا۔ اُس نے اُن سے درخواست کی، وہ کراچی آ کر نصیر سے مل کر اپنی رائے دیں۔ اُس کی درخواست پر قاسمی صاحب بہ طورِ خاص کراچی آئے۔ نصیر، اُس کے خاندان، پروین کے خاندان والوں سے بات چیت کی اور اِس رشتے پر پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

''میں نے بیٹی کے گھر میں اُس کے منگیتر سے ملاقات کی اور اپنے مثبت تأثر کا اظہار کیا۔''(8)

قاسمی صاحب کی پسندیدگی کے باوجود بقول نجمہ خانم ملک:

''پروین کو اُن کی آپا نے بہت سمجھایا کہ میں تُمھیں اپنے مشاہدے کی روشنی میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم ان کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں۔ مگر پروین یہ سمجھتی تھی کہ وہ ان سب کو ٹھیک کر لیں گی۔''(9)

مگر پھر بھی نسرین نے ڈاکٹر نصیر کو گھر بلا کر کہا:

''دیکھیے ڈاکٹر صاحب پروین اُن لوگوں میں سے ہے جن کے لیے بہت سی زبانیں بولنے والی، بہکانے والی اور بہت سے قلم تنقید کرنے والے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ حاسدوں میں گھرے رہتے ہیں۔ اگر آپ میں یہ ظرف ہے کہ آپ ہر قسم کی

بات سُن کر یا پڑھ کر برداشت کر سکتے ہیں تو فیصلہ کریں، ورنہ ان کے لیے رشتہ کی کمی نہیں۔''

اِس پر ڈاکٹر نصیر کے الفاظ تھے:

''آپ لوگوں کو اور پروین کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور ان تمام باتوں کی میں قطعی کوئی پروا نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہے گا۔''

اُن کی ہمت کو دیکھ کر گھر والے مطمئن ہو گئے جبکہ پروین کی امی ہمیشہ خوف زدہ رہیں کہ یہ لوگ بدمزاج ہیں اور پروین خوش نہ رہ سکے گی۔''(10)

عرفان جاوید صاحب نے شادی کے قصّے کو تفصیل سے بیان کیا ہے:

''یعنی اب عشق وِشق ختم ہوئے اور عائلی زندگی کا آغاز ہوا۔ نصیر علی سے پروین کی شادی 14 اکتوبر 1976ء کو ہوئی۔ شادی کے بعد پروین نصیر کے مشترکہ خاندان میں منتقل ہو گئی۔ اس خاندان میں نصیر علی کی دو شادی شدہ بہنیں، ایک شادی شُدہ بھائی اور اُس کے والدین شامل تھے۔ ساس نے گھر کا کام تقسیم کر رکھا تھا۔ صبح کے ناشتے کا اہتمام بڑی بھابی کے ذمے تھا۔ دوپہر کے کھانے کے معاملات ایک بیٹی دیکھتی جبکہ رات کے کھانے کی ذمہ داری پروین کو سونپی گئی۔ پروین کھانے پکانے کے معاملات سے ناواقف تھی۔ پکوان کی کتابوں اور بڑی بہن نسرین کی راہ نمائی میں کھانا بنانا سیکھنے لگی۔ اسے روزانہ کئی روٹیاں پکانا پڑتیں۔ رات گئے تک جوٹھے برتن دھونے پڑتے۔''(11)

عرفان جاوید نے شادی کو پروین کی زندگی کا ایک اندھا موڑ قرار دیا ہے:

''ایک ایسا موڑ جس بارے معلوم نہ تھا کہ دوسری جانب اندھی کھائی ہے یا روشن منظر۔''

یہ تو ہر مشرقی لڑکی کا المیہ ہے۔ دن رات یوں ہی گزر رہے تھے کہ پروین کی ازدواجی زندگی کا خوش گوار ترین دَور تب شروع ہوتا ہے جب نصیر کا تبادلہ ایبٹ آباد ہو گیا اور پروین کے کالج میں چھٹیاں ہوئیں اور وہ نصیر کے پاس ایبٹ آباد آ گئی اور عرفان جاوید صاحب کے مطابق پروین اُس دَور کا بہت مسرّت سے ذکر کیا کرتی تھی۔ مگر یہ وقت پل بھر میں گزر گیا اور پھر واپس

کراچی آنا پڑا۔ پروین کی ساس سخت مزاج تھیں اور پروین سے اُن کی تلخ کلامی چلتی رہتی ۔ پروین تو تُو تکار سے گریز کرتی پر معاملات خرابی کی طرف بڑھ ہی جاتے ۔ ایک مرتبہ پروین کا صبر جواب دے گیا تو وہ اپنے والدین کے پاس چلی گئی ۔نصیر نے تعلقات کو سُدھارنے کے لیے بزرگوں کو بیچ میں ڈالا اور مفاہمت کی یہ صورت سامنے آئی کہ میاں بیوی نے کرائے پر علیحدہ مکان لے کر رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

20 نومبر 1979ء کو پروین کے ہاں بیٹا مراد پیدا ہوا اور نصیر صاحب بیٹے کو اُس کی پیدائش کے دو روز بعد دیکھنے آئے ۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروین اور نصیر ریل کی دو پٹڑیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے، جو ساتھ ساتھ تو چلتی رہتی ہیں پر مِلتی نہیں ۔عرفان جاوید صاحب کے مطابق ڈاکٹر نصیر بنیادی طور پر ایک اچھا اور بھلا مانس آدمی تھا جسے پروین کی مشاعروں میں شرکت پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ کئی مرتبہ ادبی مجالس میں ساتھ بھی ہوتا۔ پروین نے مقابلے کے امتحان سی۔ ایس۔ ایس میں بیٹھنے کا اِرادہ کیا تو نصیر نے اُس سے بھرپور تعاون کیا اور تیاری کے دوران سہارا دیا۔ امتحان میں امتیازی کامیابی کے بعد کئی دیگر مسائل پیدا ہو گئے ۔اب پروین کو ٹریننگ کے لیے کراچی چھوڑ کر لاہور جانا پڑ رہا تھا تو مراد کی تحویل کا مسئلہ تھا۔ نصیر کو گوارا نہ تھا کہ وہ شوہر اور بیٹے کو چھوڑ کر دُور چلی جائے ۔ بہر حال تُو تکار کے بعد پروین بیٹے کو ساتھ لے کر لاہور چلی گئی اور ٹریننگ کے دوران مراد کبھی لاہور اور کبھی کراچی آتا جاتا رہا۔ عرفان جاوید صاحب کے بقول:

> ''پروین کے کیریئر کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا جب کہ عائلی زندگی شکست وریخت کا شکار تھی۔''(12)

پروین اور اُس کا شوہر نصیر دونوں عمدہ انسان تھے مگر ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ شاید ایک دوجے کے لیے نہ تھے۔

> ''مزاج وفکر کا تفاوت زندگی پر حاوی ہو گیا۔ باہر شہرت کے ڈنکے تھے اور گھر میں اُداسی اور حُزن آلود خاموشی تھی اور نصیر نے ایک دن پروین کے والد صاحب کو صاف کہہ دیا

کہ ''وہ لکھنا پڑھنا اور سروس کرنا چھوڑ دیں۔ مکمل گھریلو بیوی بن کر رہنا ہے تو ٹھیک ہے
ورنہ ناممکن ہے۔ میں دُنیا کی باتوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔''(13)

یہ وہی نصیر صاحب تھے جنھوں نے نسرین سے کہا تھا ''ان باتوں کی میں قطعی پروا نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہے گا۔''

ایسے کھچاؤ کے حالات میں پروین نے کراچی سے اسلام آباد اپنا تبادلہ کروالیا۔

''نصیر نہیں چاہتا تھا کہ پروین اسلام آباد میں ہو اور وہ کراچی میں، ایسے میں تو اُسے
شادی کی بنیاد صاف طور پر متزلزل نظر آتی تھی۔''(14)

ڈاکٹر نصیر علی نے پروین سے شادی کا بندھن برقرار رکھنے کے لیے اکتوبر 1986ء میں اُس سے ملاقات کی مگر دونوں باہمی رضامندی اور مصالحت کی شرائط پر آمادہ نہ ہو سکے۔ نصیر کی شرائط یہ تھیں کہ پروین شاعری چھوڑ دے اور ملازمت بھی چھوڑ کر گھریلو زندگی بسر کرے۔ مگر اب پروین کے لیے اُلٹے قدموں واپسی کا سفر محال تھا۔ پروین اور ڈاکٹر نصیر کی آخری ملاقات فروری 1987 میں ہوئی جس کے بعد دونوں میں باہمی رضامندی سے گیارہ برس کی شادی کے بعد طلاق ہو گئی۔ طلاق کی شرائط میں سے:

ایک شرط یہ بھی تھی کہ پروین دوسری شادی نہیں کر سکتی، بصورتِ دیگر اُسے اپنے بیٹے
مراد کی تحویل سے دست بردار ہونا پڑتا۔''(15)

ان لوگوں کی بدمزاجی، ڈاکٹر نصیر صاحب کی شاعری اور ملازمت بارے ناپسندیدگی کے ساتھ ساتھ کچھ چالاک، خود غرض اور مفاد پرستوں کی چالیں بھی بدگمانی اور غلط فہمی پیدا کرنے میں کامیاب رہیں۔ نجمہ خانم ملک کے بقول:

''چالاک، خود غرض، مفاد پرست لوگوں نے پروین کی شہرت اور ترقی کو پھلتا پھولتا
دیکھ کر ایسی چال چلی کہ پروین کے بارے میں افواہیں اُڑا کر پروین کے ہر قریبی
عزیز، رشتہ دار اور دوستوں کو اُن سے بدگمان کر دیا جائے، کیونکہ جب تک ان مخلص
دوستوں کا حصار نہیں ٹوٹے گا، اُن کو بدنام کرنا، اسکینڈل بنانا اور خوف زدہ کرنا
آسان نہیں ہوگا اور وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔''(16)

طلاق کے بعد گو اُس نے خود کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مصروف رکھنے اور بیٹے کی پرورش اور تربیت کو اپنی زندگی کا محور اور مقصد بنالیا تھا مگر وہ ساری زندگی اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی اور طلاق کے صدمے اور کرب کو فراموش نہ کرسکی۔ اُس نے ایک دفعہ آنکھوں میں آنسو بھر کر رفاقت جاوید سے کہا تھا:

''میں تو بہت نادان نکلی ، اچھا تھا اُس کا نام میرے نام کے ساتھ جُڑا رہتا۔ میں طلاق کے خلاف آواز اُٹھاتی۔ احتجاج کرتی، میں نے اُس کا کہا کیوں مانا؟ بے شک وہ دوسری شادی کرتا۔ مجھ سے کنارہ کشی کرلیتا۔ اُس کا نام میرے سر کی چادر ہوتا۔ وہ میرا لباس ہوتا۔''(17)

تنہائی، اس سے پیدا ہونے والا کرب اور پھر عدم تحفّظ کا احساس بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ عرفان جاوید صاحب کے بقول:

''ایک نوجوان خود مختار لڑکی تنگ ذہن، سازشی عناصر کا آسان شکار ہوتی ہے۔ کسی بھی لڑکی پر الزام لگا دیا جائے تو بقول علی شریعتی وہ داڑھی رکھ کر اپنا دِفاع نہیں کرسکتی۔ پروین سے بھی جھوٹے سچے قصّے منسوب کیے گئے اور وہ کومل، نازک جذبوں والی چینی گُڑیا سی لڑکی کمھلا کر رہ گئی۔''(18)

''پارو'' میں پروین شاکر کی تمام زندگی کی کہانی موجود ہے مگر شکر ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران اور ثروت حسین کے یک طرفہ عشق کا قصّہ موجود نہیں ہے۔ البتہ پروین کے لڑکپن کے سولھویں برس کے پہلے مجنونانہ عشق اور بعد ازاں ایک سچی محبت کا ذکر دلچسپ انداز میں موجود ہے۔ اس محبت کے الم ناک انجام کے بعد عائلی زندگی کو تفصیل سے بیان کیا گیا، گو ڈاکٹر نصیر علی بنیادی طور پر اچھے انسان تھے مگر دونوں میاں بیوی کے مزاج وفکر کا تفاوت زندگی پر حاوی ہو گیا اور آخر کار گیارہ برس کی شادی کے بعد انجام طلاق پر ہوا۔ طلاق کے بعد پروین شاکر نے بڑی تلخ زندگی بسر کی۔ طلاق کو اپنی نادانی سمجھتی رہی اور سمجھتی رہی کہ میرے سر سے چادر اُتر گئی ہے۔ رفاقت جاوید صاحبہ لکھتی ہیں کہ ایک دفعہ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ:

''آئی ایم سٹِل ینگ۔ اِس وقت بھی حفاظتی بند باندھنے کی ضرورت ہے۔''(19)

رفاقت جاوید صاحبہ کہتی ہیں اپنے تحفّظ کی خاطر پروین اپنے بڑھاپے کی تہہ دل سے خواہش کیا کرتی تھی۔ یہ باتیں صرف پروین کے دُکھ اور کرب ہی کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ مرد کے معاشرے اور اُس کی ذہنیت کا پردہ بھی تار تار کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ بھیڑیوں کے اِس معاشرے میں ایک تنہا عورت کی زندگی کس عذاب میں گزرتی ہے۔ پروین کی بڑھاپے کی خواہش تو پوری نہ ہو سکی مگر حسد و عناد کی حریصانہ ترچھی نظروں نے اُسے بھری جوانی ہی میں چھلنی کر دیا اور آخر کار وہ پروین:

''جورات کی رانی کی مہک کی عاشق تھی، موتیے کے پھولوں کے پاس چہل قدمی کیا کرتی اور گلاب کی ڈالیوں کے پاس دیر تک کھڑی رہتی تھی، اُس کے اِرد گرد موت کی بُو پھیل گئی۔''(20)

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حواشی

1۔ عرفان جاوید، روزنامہ جنگ، لاہور، سنڈے ایڈیشن، 15 اکتوبر 2017ء، ص19
2۔ عرفان جاوید، روزنامہ جنگ، لاہور، سنڈے ایڈیشن، 22 اکتوبر 2017ء، ص9
3۔ عالیہ جلیل شاہ، ''تنہا چاند''، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 1997ء، ص32
4۔ احمد پراچہ، ''پروین شاکر احوال و آثار''، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، 2003ء، ص33
5۔ نجمہ خانم ملک، ''پروین شاکر سوانحی خاکہ و دیگر مضامین''، اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، س ن، ص15-14
6۔ عرفان جاوید، روزنامہ جنگ، لاہور، سنڈے ایڈیشن، 22 اکتوبر 2017ء، ص9
7۔ ایضاً ص9
8۔ احمد ندیم قاسمی، ''میرے ہم قدم'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2007ء، ص121
9۔ نجمہ خانم ملک، ''پروین شاکر سوانحی خاکہ و دیگر مضامین'' ص18
10۔ ایضاً ص18
11۔ عرفان جاوید، روزنامہ جنگ، لاہور، سنڈے ایڈیشن، 22 اکتوبر 2017ء، ص9
12۔ عرفان جاوید، روزنامہ جنگ، لاہور، سنڈے ایڈیشن، 29 کتوبر 2017ء، ص11
13۔ نجمہ خانم ملک، ''پروین شاکر سوانحی خاکہ و دیگر مضامین'' ص28
14۔ عرفان جاوید، روزنامہ جنگ، لاہور، سنڈے ایڈیشن، 5 نومبر 2017ء، ص10
15۔ ایضاً ص10
16۔ نجمہ خانم ملک، ''پروین شاکر سوانحی خاکہ و دیگر مضامین'' ص35
17۔ رفاقت جاوید، ''پروین شاکر جیسا میں نے دیکھا''، اسلام آباد، پروین شاکر ٹرسٹ، 2014ء، ص151
18۔ عرفان جاوید، روزنامہ جنگ، لاہور، سنڈے ایڈیشن، 29 کتوبر 2017ء، ص11
19۔ رفاقت جاوید، ''پروین شاکر جیسا میں نے دیکھا'' ص64
20۔ عرفان جاوید، روزنامہ جنگ، لاہور، سنڈے ایڈیشن، 15 اکتوبر 2017ء، ص19

عرفان جاوید

پارو

پروین شاکر دادی بنی تو اُسے فوت ہوئے اُنیس برس پانچ روز گزر چکے تھے۔

سارے میں پروین مدھم لوری، گیت، مرثیے، اپنے بیٹے گیتو کو پکارتی ہوئی، سرگوشی کرتی صدا گونجتی ہے اور دل کو مسل دینے والے نوحے ''گھبرائے گی زینب'' پر دھیرے دھیرے دم توڑ دیتی ہے۔

پروین، بانو، بینا، پارہ، پارو، ایک ہی لڑکی کے نام ہیں جو نہ جانے تب کتنی تنہا تھی جب اُس کے بالوں کی لٹ اُس کی کشادہ خوں آلودہ پیشانی چوم رہی تھی اور وہ بہ مشکل سانس لے رہی تھی۔ وہ جو رات کی رانی کی مہک کی عاشق تھی، موتیے کے پھولوں کے پاس چہل قدمی کیا کرتی اور گلاب کی ڈالیوں کے پاس دیر تک کھڑی رہتی تھی، اُس کے اِرد گرد موت کی بُو پھیلی تھی۔

یہ بُو اُسے تب سے تنگ کر رہی تھی جب سے وہ اپنی سہیلی رفاقت جاوید کے ہم راہ دِلّی میں شہرت یافتہ جوتشی چوہان سے مل کر آئی تھی۔ چوہان ایک معروف نجومی تھا۔ اُس سے ملنے کے خواہش مند دُور ممالک سے بھارت آتے تھے۔ رفاقت جاوید کے شوہر دہلی کے پاکستانی سفارت خانے میں سفارت کار تھے، سو جوتشی کو اُن کی آسان دست رَس میں سمجھتے ہوئے پروین نے اُس سے ملنے کی خواہش کا اِظہار کیا۔ جوتشی چوہان کا عالی شان گھر دہلی کے سرسبز و شاداب نواح میں واقع تھا۔ بنگلے کے صحن میں گلابوں اور اگربتیوں کے دُھویں کی باہم گھلتی مِلتی مہک ماحول میں فسوں پھونکے رکھتی۔ پروین شاکر وہاں گئی تو اُس کی آنکھوں میں بے یقینی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ایسے شعبدہ بازوں پر یقین نہ رکھتی تھی۔ البتہ جب وہ واپس آئی تو اُس کی پیشانی پر تفکّر کی لکیریں اور چہرے پر سنجیدگی تھی۔

ایسا کیا ہوا تھا جس نے پروین کی سی پُریقین خاتون کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

جب چوہان نے پروین کو کمرے میں طلب کیا تو اُس نے جلدی سے اپنا سر دوپٹے سے ڈھانپ لیا اور چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

کمرے میں وہ، سہیلی رفاقت اور اُن کے شوہر جا کر جوتشی چوہان صاحب کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ چوہان صاحب نے بہ غور پروین کی طرف دیکھا، اُس کا سن پیدائش معلوم کیا، والدہ کا نام پوچھا اور اُس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں بولے ''بیٹا! عمر بہت چھوٹی لکھو کر لائی ہو۔''

اس سے پہلے جوہان نے پروین کو اُس کی تعلیم کا سرسری بتایا جسے اُس نے سنجیدگی سے نہ لیا تھا۔ البتہ جب اُنھوں نے عین حقیقت کے مطابق کہا ''بیٹا اب تک چار کتابیں لکھ پائی ہو، بہت شہرت بھی کمائی اور اس کی قیمت بھی خوب ادا کی'' تو پروین چونک گئی۔ نجومی کاغذ پر حساب لگا رہا تھا۔ اُس کی غمگین آواز کمرے میں گونجی ''اِن چار کتابوں کے بعد پانچویں کتاب نظر نہیں آ رہی۔ تمھارا بہت بڑا حادثہ ہوگا، ڈرائیور موقع پر مر جائے گا۔'' پروین نے اُن کی بات کاٹی ''میں تو بچ جاؤں گی؟'' چوہان نے پروین کی بے چینی اور پریشانی کو بھانپتے ہوئے اُسے مصنوعی دلاسا دیا۔ ''تم ٹانگ سے محروم ہو جاؤ گی۔ خون، خون نظر آ رہا ہے۔ یہ سُن کر پروین نے اضطراری کیفیت میں اُن کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا کر گود میں رکھ لیے۔

چوہان بولتے چلے گئے ''رام رام، تمھارا ماضی تمھارا پیچھا نہیں چھوڑتا، تمھاری ساس سخت مزاج تھی، تمھیں تصویر اُتروانے سے نفرت ہے۔'' اُنھوں نے جس تیقّن سے درست طور پر پروین کے ماضی کے حالات و واقعات کا نقشہ کھینچا۔ پروین کو اُن کی اپنے حادثے اور چار کتابوں تک محدود زندگی کی پیش گوئی پر یقین آ گیا۔ وہ سوچوں کے دُھندلکے میں کھوگئی اور گُم سُم ہوگئی۔

گُم تو وہ بچپن میں بھی اپنی چیزیں کر دیا کرتی تھی مگر تب گُم سُم تو وہ ہرگز نہ تھی۔

جوتشی کا واقعہ اور دیگر کئی واقعات پروین شاکر کی سہیلی رفاقت جاوید نے اپنی کتاب

''پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا'' میں بیان کیے ہیں۔اُس کے بچپن کا صحیح معنوں میں کھوج احمد پراچہ نے''پروین شاکر،احوال و آثار'' ڈاکٹر سلطانہ بخش نے''پروین شاکر۔شخصیت اور فن'' میں لگایا ہے اورفن وشخصیت پر وقیع مقالہ مالیر کوٹلہ، ہندوستان کی ڈاکٹر روبینہ شبنم نے تحریر کیا اور دیگر بے شمار تحریریں سامنے آئیں۔طویل اور چشم کُشا انٹرویو آصف فرخی نے 18 مئی 1985ء کو لیا۔پروین کے کئی دوستوں اور شناساؤں سے گفتگو ہوئی تو اُس کی شخصیت کے برفانی پربت کے فقط چند پہلوؤں پر سنہری،گلابی دھوپ پڑی اور ایک شبیہ واضح ہوگئی۔

پروین شاکر سے میری شناسائی میرے اسکول کے زمانے میں ہوئی۔میرا ایک دوست بابر بیگ ہر دوسری بات کے ساتھ یہ مصرع ٹانک دیا کرتا تھا''بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی''،مثلاً ''میں نے بہت محنت کی مگر فلاں مضمون میں فیل ہوگیا،بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی'' یا پھر''رات میں نے ابا جی کے بستر پر چادر کے نیچے باجا رکھ دیا۔وہ چادر پر بیٹھے تو باجا بج اُٹھا۔پتا چلنے پر ابا جی نے میری خوب مرمت کی،بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی۔'' یہ مصرع اُس کا تکیہ کلام بن چکا تھا اور اس تکرار سے گفتگو میں شامل رہتا کہ میری سماعت کا حصّہ بن گیا۔اِس کو وہ ایسے دُشوار مقامات اور جملوں میں غیر متوقع طور پر استعمال کر لیا کرتا کہ غالباً پروین شاکر نے اسے کہتے وقت اس کے ایسے نکتہ آفریں اور پُر معانی استعمال کا سوچا بھی نہ ہوگا۔تب مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مصرع کس کا ہے۔لڑکپن کی کم علمی کا دَور تھا۔بعد میں پروین شاکر کے بارے میں پڑھا تو معلوم ہوا کہ میں اب تک کئی مصرعے سُنتا آیا تھا جو عام گفتگو میں استعمال ہوتے تھے اور ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے تھے، پروین شاکر نامی نوجوان،منفرد اور پُر اثر شاعرہ کے تھے۔

اُردو شاعرات میں سب سے اہم اور زیادہ شہرت پانے والے چار شعری مجموعوں اور ایک کُلیات،کئی کالموں اور نثری تحریروں کی خالق پروین شاکر نے انگریزی ادبیات میں ماسٹرز کیا تھا۔وہ بہاری اور سر تا پا شیعہ تھی،متوسط خاندان سے تعلق تھا۔والد شاعر،نانا شاعر تھے اور دیگر کئی

ننھیالی عزیز اسپ شاعری کے سوار تھے۔ بیوروکریسی کا حصّہ بنی۔ ہارورڈ ایسے بین الاقوامی مؤقر اِدارے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔صبح کے وقت پیدائش ہوئی اور صبح ہی کے وقت وفات ہوئی۔ بہ وقتِ ولادت بارش ہو رہی تھی اور انتقال کے وقت بھی مینہ برس رہا تھا۔ایک مجموعے کا نام ’’خود کلامی‘‘ تھا اور اپنی مختصر زندگی میں زیادہ تر خود ہی سے کلام کیا۔عجب دلیر عورت تھی کہ کئی مردوں کی سی زندگی جی گئی اور ایسی چھوئی موئی سراپا نسوانیت تھی کہ اپنی تمام تر دل آویزی کے ساتھ زندگی کی بہتی ندی میں ’’ماہِ تمام‘‘ کے عکس کی مانند ہاتھ بھر فاصلے پر ہونے کے باوجود کوسوں دُور رہی۔

پروین کے والدین کا تعلق صوبہ بہار کے شہر پٹنا سے تھا، جہاں سے وہ قیامِ پاکستان سے دو برس قبل کراچی کی بستی چاکی واڑا میں قیام پذیر ہوئے۔ چاکی واڑا کے حوالے سے بعد ازاں معروف ادیب محمد خالد اختر نے ’’چاکی واڑا میں وصال‘‘ نامی ناول لکھا۔ کراچی کے ایک علاقے ’’خدا کی بستی‘‘ کا شوکت صدیقی صاحب کے شان دار ناول ’’خدا کی بستی‘‘ کے عنوان پر نام رکھا گیا تھا۔

پروین کے تایا جابر حسین اور منظر حسین عراق کے شہر نجفِ اشرف سے مذہبی تعلیم حاصل کرکے ذاکر بن گئے۔ والد سیّد شاکر حسین کو ابتدائی طور پر کراچی میں مصائب کا سامنا کرنا پڑا، البتہ بعد ازاں محکمہ ٹیلی فون، ٹیلی گراف میں بہ طور کلرک نوکری مل گئی۔ یوں زندگی کی کاغذی کشتی وقت کی ندی پر ڈولنے تیرنے لگی۔ پروین کے والد آٹھ بھائی اور دو بہنیں تھیں۔عجیب واقعہ ہے کہ 1930ء کی ایک وبا میں صرف تین بھائی بہ شمول سیّد شاکر حسین بچے۔ 1949ء میں اُن کی شادی افضل النّساء سے ہوئی۔ ایک برس بعد ایک بیٹی نسرین بانو پیدا ہوئی اور تین برس بعد 24 نومبر 1952ء کو فجر کے وقت کراچی کے لیڈی ڈفرن اسپتال میں پروین بانو کی ولادت ہوئی۔ اُس روز رات گئے سے بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ پروین بانو بعد ازاں پروین شاکر کے نام سے معروف ہوئی۔ کراچی کے ایک معمولی اسپتال میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والی بے شمار دوسری لڑکیوں جیسی ایک عام سی لڑکی نے اپنی خوبی اور صلاحیت کے بل پر غیر معمولی شہرت

اور مقام حاصل کر کے ثابت کیا کہ خداداد صلاحیت، مستقل مزاجی اور محنت کے سبب دُنیا کے کسی معاشرے میں بھی عروج حاصل کیا جاسکتا ہے۔

پارہ صفت پیاری سی پروین کو بچپن میں محبت سے ’’پارو‘‘ کہا جاتا تھا۔ بعد میں کالج کی تعلیم کے دوران، شاعری کے ابتدائی دِنوں میں اُس نے اپنا تخلّص ’’بینا‘‘ رکھا تھا۔

ننھی پروین لا اُبالی طبیعت کی بچی تھی، اپنی چیزیں اکثر گم کر آتی، باقاعدگی سے مجالس میں جاتی اور چپل اُتار کر بھول آتی۔ گھر میں مرغی، خرگوش، بلی اور بکری کو بہ طور پالتو جانور رکھ کر انہماک سے اُن کا خیال رکھنے میں مصروف ہوجاتی۔ اگر اُس کا کوئی جانور مرجاتا تو رو رو کر بُرا حال کرلیتی اور باقاعدہ قبر بنا کر اُس کو دفنا آتی، مبادا کوئی گوشت خور جانور اُسے کھاجائے۔

پروین شاکر کی والدہ مجالس عزا میں باقاعدگی سے جاتیں، پروین اُن کے ہم راہ ہوتی، واپسی پر اپنی پسندیدہ ذاکرہ بتول ترابی کے انداز میں مشق کرتے ہوئے محلے کے بچوں کو اکٹھا کر کے مرثیہ، نوحہ، سوز وسلام پڑھتی۔

حسن عسکری عظیم آبادی، پروین کی نانی کے پھوپھی زاد بھائی تھے، پیشے کے اعتبار سے ہومیوپیتھ تھے اور علم و ادب کا کچھ ایسا شستہ ذوق رکھتے تھے کہ پروین اور اُس کی بڑی بہن نسرین کی علمی وشعری تربیت کر کے اُن کی زبان صاف کر دی اور شعر کے شغف اور فہم سے دونوں کے وجود معطر کر دیے۔ پروین کو گڑیا سے کھیلنے کا شوق نہ تھا، درختوں پر چڑھنا، اُن سے پھل توڑ کر کھانا اور کھیل کود پسند تھے۔ بارش پروین کی کمزوری تھی۔ وہ خود گڑیا سی تھی، جسے اُس کی والدہ ہلکے گلابی اور سبز رنگ کے فراک، چوڑیاں اور پازیب پہناتیں اور نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کا انتظام کرتیں۔ اُسے نانا کے کمرے سے ہومیوپیتھک میں استعمال ہونے والی میٹھی گولیاں بھی پسند تھیں۔ پڑھنے لکھنے کا شوق ایسا تھا کہ وہ ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتی۔ گھر کا تعلیمی ماحول اُس کے ذوق کو جلا بخشتا اور شوق کو مہمیز عطا کرتا۔

ابتدائی تعلیم رائزنگ سن اسکول اور رضویہ گرلز اسکول سے حاصل ہوئی۔ درجہ چہارم

سے نعت اور تقریری مقابلے جیتتی رہی، درجہ ہشتم میں معلّمہ نے پیش گوئی لکھ کر دی ''یہ طالبہ مستقبل کی معروف ادیبہ اور شاعرہ ہوگی۔'' بعدازاں دونوں بہنوں کو سرسیّد کالج برائے خواتین میں داخلہ مل گیا۔ اِس سے پہلے پروین خداداد ذہانت کے بل بوتے پر ڈبل پروموشن حاصل کر کے بڑی بہن کے برابر آچکی تھی۔

وہ سرسیّد کالج کی مقبول ترین طالبہ ثابت ہوئی۔ وہاں اُسے عرفانہ عزیز ایسی مشفق اور باصلاحیت معلّمہ کی راہ نمائی میسّر آئی تو اُس کی صلاحیتیں چمک اُٹھیں۔ ایک اعلیٰ سطحی شعری مقابلہ ہوا جس میں مختلف کالجوں کی طالبات نے حصہ لیا۔ پروین ابھی پوری طرح مشاق و پختہ شاعروں کے برعکس اوزان وبحور سے آشنا نہ تھی۔ عرفانہ عزیز نے اُسے مشورہ دیا کہ میسّر محدود وقت میں غزل نہ کہے بلکہ ایسی نظم کہے جس میں ابلاغ اور قدرے ابہام ہو۔ فارسی لفظیات اور تراکیب اُس نے یوں یاد کر رکھی تھیں کہ اُس کے ذہنی سانچے کا حصہ بن چکی تھیں۔ پروین نے نظم کہی، پہلا انعام جیتا اور کالج کی چار دیواری سے نکل کر اُس کی شہرت پھیلنے لگی۔ اُس نے ابتدائی طور پر اپنا تخلّص ''بینا'' رکھا جو جلد ہی ترک کر دیا۔

چاکی واڑا کراچی کے متوسط طبقے کا مسکن تھا جہاں مختلف قومیتوں کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ بلوچ، مکرانی، متنوع خصائل ولسانی ذائقوں کے مہاجر، میمن، بوہری اور اندرونِ ملک سے ہجرت کر آنے والے لوگ ہنڈیا میں پکتے پکوان میں ڈالے گئے مختلف مصالحوں کی طرح تھے۔ رنگ رنگ کے لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں، طرح طرح کی روایات سڑکوں، گلیوں، بازاروں میں نظر آجاتیں۔ بعدازاں وہ لوگ ناظم آباد آ گئے جو پڑھے لکھے متوسط اور خوش حال طبقے کا علاقہ تھا۔

بالوں کو دو چُٹیا میں گوندھ کر سُتھری نِتھری پروین نفاست اور قرینے سے آگے بڑھتی رہی۔ اُس کی اُستانی عرفانہ عزیز نے اُسے یاور مہدی سے متعارف کروایا جو ریڈیو سے طلبہ کا پروگرام ''یونی ورسٹی میگزین'' پیش کرتے تھے۔ یوں پروین ریڈیو کے پروگراموں میں باقاعدگی سے حصہ

لینے لگی۔ ایک مرتبہ یاور صاحب نے شہر بھر سے طالب علم شعراء کو ریڈیو کراچی کی عمارت میں مدعو کیا، ایک کمرے میں بٹھایا اور سادہ کاغذات تھما دیے۔ اب اناؤنسر نے اعلان کر دیا ”ہمارے اسٹوڈیو میں فلاں فلاں طالبِ علم شعراء اکٹھے ہوئے ہیں، اُنھیں دو مصرعے ”طرح“ کے طور پر غزل کہنے کے لیے دیے گئے ہیں۔ اب سے تین گھنٹے بعد یہ فی البدیہہ مشاعرہ سماعت فرمائیے گا۔“

اِس اعلان کے ساتھ ہی نوجوان شعراء پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے مبادا اُن کا پول کھل جائے۔ کوئی بیمار پڑ گیا کسی کو عزیز کی بیمار پُرسی یاد آ گئی تو کوئی ضروری کام سے نکل گیا۔ پیچھے بس پانچ لوگ بشمول ایوب خاور اور پروین رہ گئے۔

اسی دَور میں پروین نے ملک کی معروف ادبی شخصیات کے ساتھ پروگرام کیے۔ اُن میں سب سے یادگار پروگرام ابن انشاء کے ساتھ تھا۔ پروین اُن دِنوں انگریزی ادب کی طالبہ تھی اور مشہور انگریزی شاعر شیلے کی شاعری سے متاثر تھی۔ سو ابن انشاء کے شعری مجموعے ”چاند نگر“ سے چاند کی علامات کا شیلے کی شاعری میں موجود چاند کے حوالہ جات سے موازنہ کر ڈالا اور ثابت کیا کہ اِبن انشاء شیلے سے حد درجہ متاثر ہیں۔ پروگرام کے بعد اسٹوڈیو سے نکل کر پروین نے انشاء سے پوچھا کہ کیا اُنھوں نے شیلے کا خوب مطالعہ کیا ہوا ہے؟ اِنشاء نے راہ داری میں اِدھر اُدھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں کہا ”شیلے؟ بی بی ذرا آہستہ بولیں کوئی سُن نہ لے۔“

اُنھی دِنوں کی بات ہے، پروین محبت کے لطیف گلابی تجربے سے گزری۔ وہ پولیس میں سرکاری عہدے پر متمکن تھا اور یہ طالبہ تھی۔ یہ جذبات میں سچی تھی اور وہ وعدوں کا پاس دار تھا۔ یہ اُنھی دِنوں کی بات ہے کہ اُس کے کچے وجود پر محبت کے دیرپا نشانات یوں ثبت ہو گئے جیسے نرم پتھر پر مہاتما بدھ کے پیروں کے نقش آج بھی بدھ مندروں میں محبت وعقیدت سمیٹتے ہیں۔ وہ کچی امبی کی کھٹی کنواری مہک لیے ہوئے تھی اور اُس کا محبوب اُس کے بہ قول برسات کی خوشبو کے مانند تھا۔ اس سے پہلے اُس کی بچپن میں ایک سگائی ہو چکی تھی جو فریق ثانی کے کم تعلیم یافتہ اور بے جوڑ ہونے کے باعث دونوں خاندانوں نے بہ رضا و رغبت ختم کر لی تھی۔

اب کے جو پروین نے محبت کے صندل کو چُھوا تو اُس کا وجود معطّر ہوگیا۔اُسے ایک قریبی خیر خواہ نے منع کیا تو وہ بہ ضد ہوگئی ’’میں تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔‘‘ وہ کیا جانتی تھی کہ یہ تجربہ دل کا روگ اور زندگی بھر کی کسک بن جائے گا۔

وہ ذہین، خوب رُو، باوقار، برسرِ روزگار اور اس سے محبت کرنے والا تھا۔ دونوں کی جوڑی خوب سجتی تھی۔لڑکے نے اپنے اہلِ خانہ کو رِشتے کے لیے پروین کے ہاں بھیجا۔ پروین کے والد رِشتہ دیکھ کر بھڑک اُٹھے۔ پروین کی یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اپنے لیے رشتہ خود تلاش کر لے اور لڑکا بھی سُنّی! یہ کٹر شیعہ تھے اور وہ سُنّی العقیدہ۔سو دوٹوک انکار ہوگیا۔ اِس اِنکار نے پروین میں کونین کی گولی کی سی کڑواہٹ بھر کر اُس کے اندر سُلگتے سرکشی کے الاؤ کو ہوا دی۔بس جو کچھ پروین کے قلب وفہم میں تھا وہ بے باکی سے تمام تر نسوانیت کے ساتھ شاعری میں سامنے لے آئی۔

کمالِ ضبط کو خود پر بھی آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دُلھن سجاؤں گی

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہوئی جیسے دُلھن کی خوشبو

وہ بدن کا پہلے پہل آگ چکھنا
رگ و پےَ میں کوئی لذت عجیب تھی

اُس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

1971ء میں پروین کا احمد ندیم قاسمی صاحب سے تعارف ہوا۔ قصّہ کچھ یوں ہے کہ سیماب صفت، من چلے اور عشق پیشہ شاعر عبیداللہ علیم نے پروین شاکر کے حوالے سے قاسمی صاحب کو تعارفی خط لکھا کہ اس ذہین لڑکی کی شاعری ''فنون'' جیسے مؤقر رسالے میں اشاعت کی مستحق ہے۔ قاسمی صاحب نے غزلیں اور نظمیں پڑھیں تو اُنھیں اس میں ''کامیاب عشقیہ شاعری'' نظر آئی۔ سو اُنھوں نے اس شاعری کو شائع کر دیا۔ یہ سلسلہ چل نکلا اور ایسا چلا کہ قاسمی صاحب پروین کے اُستاد، راہ نما اور غم گسار ثابت ہوئے۔ اُس نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''خوشبو'' کا انتساب بھی اُن کے نام کیا، جنھیں وہ پیار سے عمو کہتی تھی۔ یہ معاملہ اِتنا بڑھا کہ جب پروین کی شادی کا معاملہ چلا تو احمد ندیم قاسمی بہ طورِ خاص پروین کی درخواست پر لاہور سے کراچی آئے تاکہ ہونے والے دُلھا سے مل کر اپنی رائے دے سکیں۔ یہ بھی دلچسپ داستان ہے۔

بہرحال، پروین نے اس تعارف کے چودہ برس بعد آصف فرّخی سے بات کرتے ہوئے کھل کر اعتراف کیا ''قاسمی صاحب نے میری پوری Grooming کی ہے۔ بہت سے لوگوں میں ٹیلنٹ اور جوہر ہوتا ہے۔ اگر اُنھیں سکھایا نہ جائے، کوئی باقاعدہ کلاس نہ سہی، لیکن یہ کہہ کر دیکھو، اپنے شعر میں ذرا یہ لفظ تبدیل کر کے دیکھو، کیسی چمک آجاتی ہے۔ اُنھوں نے مجھے اِتنی چھوٹی چھوٹی باتیں سکھائیں۔ یہ بھی کہ میں کیا پڑھوں، مزید کیا پڑھوں۔''

پروین اپنی زندگی کے ناول کے ایک باب کے بعد نہیں جانتی تھی کہ آئندہ باب میں کیا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی کتاب کی مصنّفہ نہ تھی، فقط ہیروئن تھی۔ اِس کہانی میں نصیر نامی کردار داخل ہوتا ہے۔ پُرلطف ماجرا تو یہ ہے کہ پروین کی وجۂ شہرت اُردو زبان تھی، اُس نے تعلیم انگریزی ادب میں حاصل کی، اُس نے ماسٹرز کیا اور عبداللہ کالج کراچی میں نو برس تک انگریزی کی لیکچرر رہی۔ معروف ادیب اور دانش ور اسلم فرّخی کراچی یونی ورسٹی میں شعبۂ تدریس سے وابستہ تھے۔ وہ گھر میں اپنی ایک طالبہ کا تذکرہ کرتے تھے جو جماعت میں اچھی شاعری پر باقاعدہ جھومتی تھی۔ وہ پروین شاکر کے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ داغستان کے شاعر رسول حمزہ توف کی محبوبہ کے

عاشق صادق کے بہ قول کوئی اور اُس جیسا کیسے ہو سکتا تھا۔

پروین کے لڑکپن کے سولھویں برس کے پہلے مجنونانہ عشق اور بعد ازاں ایک سچی محبت پر شادی سے گھر والوں کے انکار نے پروین کو نفسیاتی اضمحلال سے دو چار کر دیا۔ نازک، جذباتی لڑکی تھی، قلبی سانحات سہ نہ پائی اور اُسے چند ایک بار بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اُس کی والدہ کی ماموں زاد بہن کے بیٹے ڈاکٹر نصیر علی کو عموماً مشورے کے لیے بلایا جاتا۔

نصیر علی نے لاہور کے بہترین کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا اور پاکستان آرمی میں بہ طور کپتان تعیّنات تھا۔ اُس کا خاندان 1971ء کی شورش کے دوران چٹاگانگ سے کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ بہ ظاہر تو اس خاندان کے پروین کے خاندان سے خاصے خوش گوار تعلقات تھے۔ البتہ نصیر کی والدہ ایک سخت مزاج خاتون تھیں۔ پروین کے علاج معالجے کے دوران دونوں خاندانوں کو قریب آنے کا موقع ملا۔ نصیر کے دل میں پروین کو اپنانے کی خواہش اُبھری اور اُس نے اِس کا اصرار اظہار کر دیا۔ اُس کی والدہ ایک روایتی خاتون تھیں جو اپنے بیٹے کے لیے امیر خاندان سے گھریلو دُلہن لانا چاہتی تھیں جو گھر گرہستی کے معاملات سنبھال سکے۔ پروین شاعرہ تھی، معلّمہ تھی، معروف تھی، خوش شکل تھی سو معاملاتِ دیگر بھی غلط طور منسوب ہو جاتے تھے، اور وہ نصیر کی والدہ کی خواہشات کے مطابق نہ تھی۔ جب نصیر کا اصرار بڑھا تو طوعاً و کرہاً اُس کے اہلِ خانہ نے آمادگی ظاہر کر دی۔

اُدھر آمادگی سامنے آئی، اِدھر پروین کی والدہ کے دل میں وسوسے کیکڑوں کی طرح پنجے جمانے لگے۔ اُنھیں اس خاندان میں بناوٹ اور گھٹن کا احساس ہوتا۔ پروین کی والدہ نے نصیر کی ماں کو بتایا کہ پروین گھر داری کے معاملات میں کوری ہے، کھانے پکانے سے نابلد ہے، سلائی کڑھائی جانتی ہے اور نہ ہی اس میں دل چسپی رکھتی ہے۔ البتہ اسے پڑھنے لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔

نصیر کی ماں نے اُنھیں تسلّی دلائی کہ ایسی کوئی بات نہیں، سبھی لڑکیاں کہاں یہ جانتی

ہوتی ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ سیکھ لے گی۔ یہ اُس دَور کی بات ہے کہ خواتین کی، سوائے طب اور تعلیم کے شعبوں کے، ملازمت معیوب سمجھی جاتی تھی، گھرداری فرائض میں شامل تھی اور عورت کے پاس انتخاب کی گنجائش کم تر تھی۔ شادی کے معاملات بڑھے اور پروین کے وساوس میں اضافہ ہوا۔

یہاں اُسے اپنے عمّو احمد ندیم قاسمی صاحب کا خیال آیا۔ اُس نے اُن سے درخواست کی کہ وہ کراچی آ کر نصیر سے مل کر اپنی رائے دیں۔ اُس کی درخواست پر قاسمی صاحب بہ طورِ خاص کراچی آئے، نصیر، اُس کے خاندان، پروین کے خاندان والوں سے بات چیت کی اور اِس رشتے پر پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔

پروین کی شادی نصیر سے اکتوبر 1976ء میں نارتھ ناظم آباد کے ''الحسن میرج ہال'' میں انجام پائی۔ دُلہن نے سُرخ قمیص، سُرخ دوپٹّا اور سبز پاجامہ پہن رکھا تھا اور چندرما کی طرح دمک رہی تھی۔ شادی کو سادہ رکھا گیا، مہندی کی رسم نہ کی گئی، حق مہر چودہ ہزار روپے مقرر کیا گیا، کھانے پر پابندی کے باعث صرف مشروبات پیش کیے گئے۔ یوں پروین کی زندگی کی کہانی میں اندھا موڑ آیا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس موڑ کی دوسری جانب اندھی کھائی ہے یا روشن منظر۔

شادی کے بعد ایک اور معاملہ درپیش ہوا۔ اب تک ملک کے ادبی حلقے اُس کے نام سے واقف ہو چکے تھے۔ چناں چہ اُس نے اپنی اَنا اور جدّت پسند رَوِش کے مطابق طے کیا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام نہ لگائے گی۔ اُس کے شوہر نے اُس کا ساتھ دیا۔ یوں اُس کا نام پروین شاکر ہی برقرار رہا۔

قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کی نواسی، پروین کی کلاس میں طالبہ اور پروین کی مقرّبِ خاص رُخسانہ نے پروین کی شادی کا فوٹو البم تیار کیا۔

شادی کے بعد پروین نصیر کے مشترکہ خاندان میں منتقل ہو گئی۔ اس بھرے پُرے خاندان میں نصیر علی کی دو شادی شدہ بہنیں، ایک شادی شدہ بھائی، بھابی اور اُس کے والدین

شامل تھے۔ پروین کی سب سے پہلے اپنی بھابی سے دوستی ہوئی ۔ساس نے گھر کا کام تقسیم کر رکھا تھا۔صبح ناشتے کا اہتمام بڑی بھابی کے ذِمّے تھا، دوپہر کے کھانے کے معاملات ایک بیٹی دیکھتی جب کہ رات کے کھانے کی ذِمّے داری پروین کو سونپی گئی۔ پروین کھانے پکانے کے معاملات سے ناواقف تھی سو پکوان کی کتابوں اور بڑی بہن نسرین کی راہ نمائی میں کھانا بنانا سیکھنے لگی۔اُسے روزانہ کئی روٹیاں پکانی پڑتیں، رات گئے تک جوٹھے برتن دھونے پڑتے اور وہ تھک ٹوٹ کر ایسی سوتی کہ کالج جانے سے پہلے پہل ناشتا کرنے میز پر آجاتی ورنہ ناشتا نہ ملتا تھا۔

دن رات یوں ہی گزر رہے تھے کہ پروین کی زندگی کا خوش گوار ترین دَور شروع ہوگیا۔

نصیر کا تبادلہ ایبٹ آباد ہوگیا۔تب ایبٹ آباد ایک برطانوی طرز کا خوب صورت پُر فضا پہاڑی شہر تھا۔اُس میں راج دور کی بُو باس موجود تھی۔ملٹری کا اہم مقام ہونے کی وجہ سے،قریب میں کاکول اکیڈمی، ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی آماج گاہ ہونے کے باعث ایک نظم تھا۔اُسے صنوبروں کی بستی بھی کہا جاتا تھا۔ہر سُو جنگلی ہوا، گھنے جنگل، سرسبز پہاڑیاں اور تازہ ٹھنڈے پانی کی ندیاں اور چشمے اسے خواب ناک شہر بناتے تھے۔ پروین کے کالج میں چھٹیاں ہوئیں تو وہ نصیر کے پاس ایبٹ آباد آگئی۔ یہاں اُسے ازدواجی زندگی کا پُرسکون اور بھرپور وقت گزارنے کا موقع ملا۔اِس دوران نصیر کے والدین اور بہنیں بھی مختصر قیام کے لیے آتے رہے۔ پروین اُس دَور کا بہت مسرّت سے ذکر کیا کرتی تھی۔اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنا تبادلہ بھی کراچی سے ایبٹ آباد کرالے گی۔البتہ نصیر کے خاندان کی سوچ مختلف تھی۔وہ چاہتے تھے کہ نصیر واپس کراچی چلا آئے۔اُس کے بڑے بھائی کی بے وقت وفات کی وجہ سے بھی اُس کی والدہ بہت اُداس رہتی تھیں۔وہ بھی ایک سعادت مند بیٹا تھا سو ایک برس بعد کراچی چلا آیا۔ساتھ میں پروین بھی چلی آئی۔یوں یہ وقت پل بھر میں گزر گیا۔پروین کی ساس سخت مزاج تھیں اور پروین سے اُن کی تلخ کلامی چلتی رہتی تھی۔ پروین کا سب سے غم گسار رشتہ اُس کا اپنا شوہر تھا، بعد میں بھابی تھی۔ پروین تو

تکار سے گریز کرتی پر معاملات خرابی کی جانب بڑھ ہی جاتے۔ایک مرتبہ پروین کا صبر جواب دے گیا تو وہ اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔

اِس دوران نصیر نے فوج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔وہ خواہاں تھا کہ شادی چلتی رہے۔ چناں چہ تعلق کو سدھارنے کے لیے بزرگوں کو بیچ میں ڈالا گیا اور مفاہمت کی ایک صورت سامنے آئی۔میاں بیوی نے کرائے پر علیحدہ مکان لے کر رہنے کا فیصلہ کیا اور پروین کے والدین کے گھر کے پاس ایک عزیز کے مکان کا حصّہ کرائے پر لے لیا گیا۔

پروین کی شادی کو تین برس ہو چلے تھے۔اب تک وہ ارادتاً خاندان بڑھانے سے گریز کر رہے تھے۔تین برس بعد اِرادہ بدلا،ایک روز لیڈی ڈاکٹر نے اُسے خوش خبری سُنائی کہ وہ اُمید سے ہے۔میاں بیوی نے فیصلہ کیا کہ اگر اُن کے ہاں بیٹی ہوئی تو اُس کا نام شفا رکھیں گے اور بیٹے کا نام مراد علی رکھیں گے۔

20 نومبر 1979ء کو پروین کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔افسوس ناک امر یہ تھا کہ نصیر علی بیٹے کو اُس کی پیدائش کے دو روز بعد دیکھنے آیا۔اُمید تھی کہ بچے کی پیدائش کے بعد پروین کے اپنی سسرال سے تعلقات اچھے ہو جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔نتیجتاً جب مراد بڑا ہو رہا تھا تو نصیر صبح ملازمت پر چلا جاتا اور پروین بیٹے کو اپنی ماں کے ہاں چھوڑ کر کالج پڑھانے چلی جاتی۔وہ مراد کو پیار سے گیتو کہتی تھی۔اس نام کے پیچھے ایک دل کو چُھو لینے والا واقعہ تھا جو اُس نے اپنی سہیلی رفاقت کو سنایا تھا۔

’’مراد چند ماہ کا تھا۔ہمیشہ اُسے لوری سے سُنایا کرتی تھی۔ایک رات میں ٹیبل لیمپ کی لائٹ آف کر کے اُس کے پاس لیٹی ہی تھی۔اس سے پہلے کہ اپنے شہزادے کو لوری سُناتی،مراد نے اپنی آواز میں ہوں ہوں کرتے ہوئے گنگنانے کے انداز میں مجھے لوری سنانا شروع کر دی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں،میں نے خوشی سے مغلوب ہو کر اُس کے چھوٹے نازک سے کندھے کے ساتھ اپنا سر ٹکا دیا اور محظوظ ہونے لگی۔اُس کے گلے سے وہ مدھر سی دُھن اُس وقت تک اُبھرتی

رہی جب تک وہ گہری نیند میں نہ چلا گیا تھا۔میں یہ عمل روزانہ دُہرانے لگی تھی اور پھر ایک رات بے اختیاری و بے ساختگی سے اُسے گیتو کہہ کر پکارنے لگی تھی۔“

مراد کی پیدائش کے چوتھے ماہ کی بات ہے، پروین کی ماں اور بڑی بہن ہندوستان عزیزوں کو ملنے گئی ہوئی تھیں، وہ اپنے والد کی دیکھ بھال کے لیے میکے میں تھی، جب اُس نے اپنے شوقِ حصولِ علم، جستجو اور زندگی میں آگے بڑھنے کی خواہش کے تحت والد سے انگریزی لسانیات میں ایم اے کرنے کی اجازت طلب کی۔ والد نے اجازت دے دی ۔والدہ اور ہمشیرہ ہندوستان سے لوٹیں تو اس اجازت کی مخالفت کی۔ والد نے پروین کی حمایت جاری رکھی۔ یوں 1981ء میں امتحان میں درجۂ اوّل میں کامیابی حاصل کی۔ 1980ء میں اُس کا دوسرا مجموعۂ کلام ”صد برگ“ کے عنوان سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا تھا۔اُس کی شہرت قومی سطح سے نکل کر بین الاقوامی سطح تک پہنچ چکی تھی اور اُسے بھارت میں مشاعروں کی دعوتیں وصول ہو رہی تھیں۔

پروین اور نصیر ریل کی دو پٹڑیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے، جو ساتھ ساتھ تو چلتی رہتی ہیں پر ملتی نہیں۔

پروین کے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ فزوں تر تھا،نصیر حالات پر شانت اور میسّر پر قانع تھا۔ کہتے ہیں، اس میں جستجو کا جذبہ مفقود اور بہتری کی خواہش ناداردتھی۔اُس نے فوج کی نوکری چھوڑ کر سوشل سیکورٹی کے ادارے میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور اپنا ذاتی کلینک چلاتا تھا۔اُس کی زیادہ تر توجہ اپنے خاندان کی جانب مرکوز رہتی تھی۔ پروین بیٹے کو بیماری کی صورت میں اکیلی ڈاکٹر کے پاس لے جاتی، گھر کے کام دیکھتی اور بچے کو ننھیال لے جاتی۔نصیر چھٹی کے دن گھر پر آرام کرتا، کرکٹ دیکھتا، بیوی سے کہہ دیا تھا کہ وہ صرف سوشل سیکورٹی اسپتال ہی میں نوکری کرے گا، کرائے کے مکان ہی میں رہے گا اور بیٹے کو سرکاری اسکول میں پڑھائے گا۔ یہ باتیں پروین ایسی ترقی کی خواہاں لڑکی کے لیے روح کا سوہان ثابت ہوتیں۔

ڈاکٹر نصیر بنیادی طور پر ایک اچھا اور بھلا مانس آدمی تھا، جسے پروین کی مشاعروں میں

شرکت پر کوئی اعتراض نہ تھا،کئی مرتبہ ادبی مجالس میں ساتھ بھی ہوتا اور اُس کی کامیابی پر خوش ہوتا۔اُس نے پروین کی مزید تعلیم پر بھی اعتراض نہ کیا،اُسے علیحدہ کرائے کا گھر بھی لے کر دیا اور اُس کی تخلیقی نمو و پرداخت میں رکاوٹ نہ بنا۔

اختلاف تھا تو سوچ کا،مزاج کا۔

پروین نے مقابلے کے امتحان سی ایس ایس میں بیٹھنے کا اِرادہ کیا تو نصیر نے اُس سے بھرپور تعاون کیا اور تیاری کے دوران سہارا دیا۔

پروین کی زندگی کے ناول میں ایک رکاوٹ اور ایک ثانوی کردار داخل ہوتے ہیں۔ یہ کردار بریگیڈیر صدیق سالک کا تھا۔صدیق سالک جنرل ضیاء الحق کی جنتا کے نمایاں چہروں میں سے ایک تھے۔جنھوں نے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں حصّہ لیا تھا۔ 1971ء کی جنگ کے بعد بھارت کی قید میں رہے اور عمدہ تصنیفات ’’ہمہ یاراں دوزخ‘‘،’’تادمِ تحریر‘‘،’’ایمرجنسی‘‘،’’پریشر کُکر‘‘،’’سلیوٹ‘‘اور’’میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا‘‘ کی وجہ سے اہم ادبی مقام حاصل تھا (افسوس اسّی کی دَہائی میں سالک کی مقبولیت پانے والی عمدہ کتب کس طرح زمانے کی یادداشت سے مٹتی جاتی ہیں)۔ بعد ازاں صدیق سالک جنرل ضیاء الحق کے ہمراہ طیارہ حادثے میں راہیٔ اجل ہوتے ہیں۔

بہرحال مقابلے کے امتحان میں ایک بنیادی رکاوٹ پروین شاکر کی عمر تھی۔وہ حدِعمر پار کر چکی تھی۔اُسے امتحان میں بیٹھنے کی خصوصی اجازت صرف صدرِ مملکت سے مل سکتی تھی۔وہ اُبھرتی ہوئی اور مسلسل رُو بہ عروج شاعرہ تھی۔مشاعروں اور ادبی تقریبات کا نمایاں نام تھی،خوب رُو تھی، جلد توجہ حاصل کر لیتی تھی،توانا نسوانی آواز تھی جو عورت کے جذبات کی عکاس تھی اور منفرد تھی سو ادیب و ادب شناس صدیق سالک تک رسائی رکھتی تھی۔

ایک معجزہ ہوا۔ضیاء الحق نے صدیق سالک کی درخواست پر عمر کی حد میں استثنا دیتے ہوئے پروین شاکر کو مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کی خصوصی اجازت دے دی۔

پروین نے دن رات امتحان کی خوب تیاری کی اور ملک بھر میں امتیازی کامیابی حاصل کرتے ہوئے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ مقابلے کے امتحانات کے حوالے سے ایک حیران کُن امر یہ تھا کہ اُس کے اختیاری مضامین میں اُردو کا پرچہ بھی تھا، اُس میں جن کتابوں پر تبصرہ کرنے کا کہا گیا اُن میں پروین شاکر کی اپنی کتاب ’’خوشبو‘‘ شامل تھی۔ بہت بعد میں پروین نے ہنستے ہوئے آصف فرّخی کو بتایا ’’میں نے اپنی کتاب پر اِتنا سخت تبصرہ لکھا جتنا شاید میرے سخت مخالف نے بھی نہ لکھا ہو۔ میں نے اِتنی کڑی تنقید اِس لیے کی تاکہ میں پہچانی نہ جاؤں کہ میں اپنی ہی کتاب پر تبصرہ کر رہی ہوں۔ البتہ تب میں نے اندازہ لگایا کہ میں اچھی خاصی نقاد بھی بن سکتی ہوں۔‘‘ جب پروین کو ٹریننگ کے لیے کراچی چھوڑ کر لاہور جانا پڑ رہا تھا تو بیٹے مراد کی تحویل کا مسئلہ درپیش ہوا۔ نصیر کو گوارہ نہ تھا کہ وہ شوہر اور بیٹے کو چھوڑ کر دُور چلی جائے۔ پروین کے والد نے یہ توجیہ پیش کی کہ ان حالات کا ادراک نصیر کو پہلے کر لینا چاہیے تھا تو وہ بے بسی سے بولا ’’خالو میں نے تو اسے ویسے ہی اجازت دی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ امتحان میں کام یاب ہو جائے گی۔‘‘

نصیر معاشی آزمائش کا شکار ہو چکا تھا، اُس کا ذاتی کلینک بِک چکا تھا اور فقط سوشل سیکورٹی کی آمدنی بہ قدرِ اشکِ بلبل رہ گئی تھی۔ معاشی بے حالی بھی میاں بیوی کے درمیان تناؤ کی وجہ بنتی چلی آ رہی تھی۔

اُوپر سے بیٹے کا معاملہ درپیش تھا۔ پروین کے والدین اُسے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ نصیر کی خواہش تھی کہ مراد یا تو ماں کے پاس رہے یا باپ کے پاس ہو۔ کسی تیسرے شخص کے پاس ہونا مناسب نہ تھا۔ اِس سب تکرار در تکرار سے عاجز آ کر پروین بیٹے کو ساتھ لے کر ٹریننگ پر لاہور چلی گئی۔

وہ لاہور تو چلی گئی پر باپ بیٹے کے بغیر اُداس ہو گیا اور ہفتے بھر بعد نصیر علی، مراد کو واپس کراچی لے آیا اور اُسے پروین کے والدین کے پاس چھوڑ دیا۔

لاہور کا علمی و ادبی ماحول گویا پروین کا منتظر تھا۔ یہاں اُس کے عمّو احمد ندیم قاسمی

صاحب اور دیگر کئی ادبی دوست تھے۔ اکیڈمی میں اُس کے کمرے کی ہم نشیں طلعت الطاف اُس کی گہری سہیلی بن گئی۔ اکیڈمی میں پروین کے پاس ایک پرانی فوکسی گاڑی تھی جس میں بیٹھ کر پروین اور چند قریبی دوست لاہور کے ادبی ٹھکانوں پر جاتے، مباحثوں میں شریک ہوتے، چائے پان سے لطف اندوز ہوتے اور لوٹ آتے۔

پروین کو نئے سرے سے اسٹوڈنٹ لائف کا لطف آرہا تھا۔ البتہ شادی کی کدورت پلاؤ کے چاولوں میں آئے کنکر کی طرح تنگ کر رہی تھی۔

نصیر نے نئے سرے سے اصرار شروع کر دیا کہ پروین مراد کو کراچی آ کر لاہور لے جائے۔ اُس پسند نہ تھا کہ بچہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے دوسرے گھروں میں پرورش پائے۔ اُس کی ضد کے آگے مجبور ہو کر پروین مراد کو لے کر اکیڈمی آ گئی۔

ایک مرتبہ لازمی ملکی دورے پر پروین، مراد کو لے کر اسلام آباد میں زیرِ تربیت افسران کے ہمراہ ایم این اے ہاسٹل میں ٹھہری تو وہاں مراد کی طبیعت بگڑ گئی۔ ایسے میں محکمہ کسٹم کے شاہد رحیم شیخ اور سہیلی طلعت الطاف، پروین کی مدد کو بڑھے اور بچے کو فوری طور پر اسپتال کے ہنگامی شعبے میں لے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں کی توجہ سے بچے کی حالت سنبھل گئی۔ اس دوران طلعت پروین کے والدین کو مراد کی صحت کی خرابی کی اطلاع دے چکی تھی۔ وہ لوگ ہنگامی طور پر اسلام آباد پہنچے۔ بچے کی سنبھلی حالت دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی اور یوں ایک آزمائش ٹلی۔

پروین نے یک سُوئی سے ٹریننگ جاری رکھی اور 154 طلبہ میں سے امتیازی کارکردگی سے اکیڈمی کا امتحان پاس کیا۔ ''بہترین زیرِ تربیت افسر'' کا اعزاز پایا، سونے کا تمغہ حاصل کیا اور محکمہ کسٹمز میں بہ طور افسر اُس کی تعیناتی ہوئی۔ پروین کے کیریر کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا جب کہ عائلی زندگی شکست و ریخت کا شکار تھی۔

ایک جوان خود مختار لڑکی تنگ ذہن، سازشی عناصر کا آسان شکار ہوتی ہے۔ کسی بھی لڑکی پر الزام لگا دیا جائے تو بہ قول علی شریعتی وہ داڑھی رکھ کر اپنا دِفاع نہیں کر سکتی۔ پروین سے بھی

جھوٹے سچے قصّے منسوب کیے گئے۔وہ کومل نازک جذبوں والی چینی گڑیا سی لڑکی کملا کر رہ گئی۔

اسلام آباد کا واقعہ ہے، بہار کا خوش گوار دن تھا۔آسمان روشن تھا اور تازگی بھری ہوا مارگلہ کی پہاڑیوں سے ٹکراتی، بیچ سے گزرتی ماحول میں مسرت بکھیر رہی تھی۔ایک سرسبز گرین بیلٹ کے سامنے بڑی سی کوٹھی کے نفاست سے سجے ڈرائنگ روم میں فیض احمد فیض چند دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔وہاں پروین شاکر بھی موجود تھی،وہ پہلے بھی کئی مرتبہ فیض صاحب سے مل چکی تھی۔وہ اُن کی متانت،مزاج کی نرمی اور ذات کی شگفتگی کے باعث اُس سے حالِ دل بیان کرنے میں آسانی محسوس کرتی تھی۔اُس روز اِرد گرد لوگ خوب مسکرا رہے تھے اور قہقہے اُبل رہے تھے۔فیض صاحب شروع سے کم گو تھے،بڑھاپے میں آ کر چُپ شاہ ہو چکے تھے۔پروین گم سم، اُداس بیٹھی تھی۔لوگوں کے بکھر جانے کے بعد جب فیض صاحب کو اُس سے بات کرنے کا موقع ملا تو اُنھوں نے اُس کی اُداسی کی وجہ دریافت کی۔اُس نے بتایا کہ وہ نہ صرف لوگوں کی تہمتوں کی وجہ سے خائف ہے بلکہ اپنی معاصر شاعرات کے حسد کے باعث بھی دُکھی ہے۔اُس نے تو کبھی دانستہ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی کسی کا بُرا سوچا ہے۔ اُس کی ہم قبیل عورتیں زیادہ جلاپے میں اُس کی بدخوئی کرتی ہیں۔اِس پر فیض صاحب نے بہت شفقت سے اُسے سمجھایا ''تم بہت بے وقوف لڑکی ہو،نظر انداز کرو۔تم نے کبھی ہمیں پلٹ کر جواب دیتے دیکھا ہے؟ جس کا جو جی چاہے، اُسے کہنے دو۔وہ اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔تم اِن چیزوں میں پڑ کر اپنی صلاحیتیں مت گنواؤ۔اب مجھے کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔شروع میں بہت دُکھی ہوتا تھا،اب نہیں ہوتا۔''

اپنی معاصر شاعرات کے حوالے سے فہمیدہ ریاض کو وہ اُس کی جرأت پر سراہتی تھی۔ فہمیدہ ریاض کے ہاں موضوعاتی اور لسانی بے باکی دیکھ کر پروین کی ہمت بندھی کہ عورت ایسا بھی لکھ سکتی ہے۔البتہ اُس کا خیال تھا کہ فہمیدہ نے سیاست کو اپنی شاعری میں غیر ضروری جگہ دے کر اس کے معیار سے سمجھوتا کیا۔کشور ناہید سیدھے سبھاؤ والی براہِ راست شاعری سے رمزیہ شاعری کی

جانب آ گئی۔اس وجہ سے عام قاری شعوری سطح نہ رکھنے کے باعث اس شاعری کو سمجھنے سے محروم رہ گیا۔وہ کشور ناہید کو ’’شاعرات کی شاعرہ‘‘ قرار دیتی تھی۔وہ شاہدہ حسن کی صلاحیت،عشرت آفرین (اگر وہ فقط ایک خاص نظریے کی ترجمانی نہ کرے) سارا شگفتہ کے ہاں دلیرانہ اندازِ تکلّم اور نسرین انجم بھٹی کے اندرونی آہنگ کے باعث مستقبل کی نمایاں شاعرات کے طور پر دیکھتی تھی۔سارا شگفتہ تو الم ناک موت کا شکار ہو کر جلد ہی کوچ کر گئیں۔شاہدہ حسن اور عشرت آفرین کے ہاں امکانات کی فصل موجود ہے اور نسرین انجم بھٹی یقیناً اِس دور کی شاعرات میں سب سے زیادہ زرخیز اور توانا آواز ہے۔سو پروین کے وجدان کے پرندے نے درست شاخوں پر اپنا مسکن بنایا۔وہ روایتی اساتذہ کی پیروی میں شاعری کی اصل کسوٹی ’’پابند شاعری‘‘ کو تسلیم کرتی ہے جو اس معیار پر پورا اُترے، بھلے بعد میں دیگر تجربات کرتا رہے، صحیح معنوں میں قابل قدر شاعر ہے۔

ایک شام کراچی کے متوسط خوش حال، پڑھے لکھے طبقے کے اقامتی علاقے گلشن اقبال کے ایک سادہ سے مکان میں منعقد ہونے والی ایک ادبی نشست میں پروین نے ادب کے حوالے سے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔کسی نے اُس سے پوچھا کہ وہ شاعری کیوں کرتی ہے تو اُس نے اپنے مخصوص انداز میں پیشانی پر آتی بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے چہرے کو ایک طرف جھکاتے ہوئے جواب دیا۔’’کوئی چیز بھی مجھے شاعری کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے، میرے دل اور جذبات کو متاثر کر سکتی ہے، کوئی دُکھ، بے پناہ خوشی، دریافت کا لمحہ، حیرت، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔الفاظ سے مجھے عشق ہے، یہ مسحور کرتے ہیں، میری اتنی زندگی کتابوں میں گزری ہے کہ اب میں ہر جذبے کو الفاظ میں ڈھالنے میں آسانی محسوس کرتی ہوں۔‘‘

جب اُس سے پوچھا گیا کہ اُس کی ابتدائی شاعری میں رومان کی واضح چھاپ ہے، کیا بعد کی شاعری میں مزید پختگی اور تنوّع آئے گا؟ تو اُس نے سوچتے ہوئے اپنے پیر صوفے پر اپنے نیچے سمیٹ لیے (جیسا کہ وہ اکثر کیا کرتی تھی، چپل اُتار کر، پیروں کو سمیٹ لیا کرتی تھی، پرندے کی طرح سمٹ جاتی تھی) اور بامعانی اور پختہ انداز میں کہنے لگی’’جب میری پہلی کتاب ’’خوشبو‘‘ سامنے

آئی تو تب تک میں اپنے اندر دیکھ رہی تھی، بعد میں مجھ پر منکشف ہوا کہ میرے اِرد گرد بہت سے لوگوں کے ایسے ہی مصائب ہیں، وہ خواب دیکھتے ہیں جو ٹوٹ جاتے ہیں، سو بعد کی شاعری میں، بالخصوص ''صد برگ'' میں خارج کا، آس پاس کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

پروین کی شاعری مختلف مدارج اور ارتقائی منازل طے کرتی رہی البتہ گلاب، خوشبو، ہوا، پانی، پرندے اور مخصوص علامات مستقل موجود ہیں۔

پروین شاکر پر کام کرتے ہوئے ایک دل چسپ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ قیامِ پاکستان کے بعد اُردو نثر میں نمایاں کام اُردو بولنے والوں کے علاوہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ادبا نے کیا۔ البتہ خواتین کی شاعری میں نمایاں نام پروین شاکر، کشور ناہید، شاہدہ حسن، زہرا نگاہ، ادا جعفری اور بیشتر شاعرات کا تعلق خالصتاً اُردو بولنے والے (مہاجر) طبقے سے ہے (اس میں استثنا سارا شگفتہ، نسرین انجم بھٹی اور گنتی کی چند شاعرات کو ہے)۔ ایسی کیا لسانی، ثقافتی، سماجی وجوہ ہیں جنھوں نے اُردو بولنے والی خواتین کو شاعری کی جانب رجوع کرنے اور اعلیٰ پائے کی شعری تخلیقات سامنے لانے پر آمادہ کیا۔ کیا اُردو بولنے والی خواتین میں شعور زیادہ تھا، معاشرتی آزادی بڑھ کر تھی یا تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان میں روشن خیالی زیادہ تھی؟ غور طلب معاملات ہیں۔

پروین میں ایک ادا ضرور تھی، وہ اپنی شاعری پر نازاں تھی، اِس لیے اپنی شاعری کی اشاعت سے پہلے، ابتدائی دِنوں میں عرفانہ عزیز سے اصلاح لیتی تھی اور بعد ازاں یہ سلسلہ احمد ندیم قاسمی پر ختم ہو گیا۔ وہ کہتی تھی ''اس کے علاوہ میں نے اپنی شاعری کسی کو نہیں دِکھائی اور نہ کبھی کسی کو یہ حق دیا کہ کوئی لفظ کاٹے یا تبدیل کرے۔''

پروین سمجھتی تھی کہ قومی سطح پر اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر معروف ہونے والی خواتین کم ہیں، ایسی خواتین جو کسی مرد کی بیوی، بیٹی، بہن یا عزیزہ ہونے کے باعث معروف و محترم نہ ہوں بلکہ اپنی انفرادی خوبی کی وجہ سے جانی جائیں، کم یاب ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایسی کم

عمر لڑکیاں جو تخلیقی کام میں مصروف ہوں اور اپنی ذات و تخلیق کی وجہ سے دل کشی کی حامل ہوں، جلد ہی لوگوں کی دل چسپی کا مرکز بن جاتی ہیں اور ایک پدرسری معاشرے میں بدقسمتی سے منفی رائے کو اپنی جانب یوں کھینچتی ہیں جیسے مقناطیس لوہے کی کیلوں کو۔

پاک و ہند کی روایت میں، ماضی میں شاعری بیگمات، شہزادیاں یا کوٹھے کی طوائفیں کرتی تھیں۔ جیتی جاگتی عام عورت تاریخ میں شاعری (میرابائی وغیرہ ایسی کرشنا کی معتقد، درویش شاعرہ اور چنیدہ استثنات سے ہٹ کر) کرتی نظر نہیں آتی۔ یہ بیسویں صدی کی ہندوستانی روایت ہے۔

پروین کی زندگی کے حوالے سے چند دل چسپ واقعات اور باتیں ہیں۔ وہ کہتی تھی تقریر انسان کو ہجوم کی طرف لے جاتی ہے، شاعری تنہائی کی جانب۔

پروین کسٹم ہاؤس کراچی میں تعیّنات تھی کہ اُسے فیصل آباد ڈسٹرکٹ جیل سے ایک قیدی کا خط آیا۔ اُس قیدی کو سزائے موت ہو چکی تھی۔ اُس نے صدرِ مملکت سے رحم کی اپیل کر رکھی تھی۔ اُسے اپنے زندہ رہنے کی امید نہیں تھی۔ اپنی زندگی اور حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے قیدی نے پروین سے درخواست کی کہ وہ مرنے سے پہلے پروین کے دست خطوں والی اُس کی شاعری کی کتاب پڑھنا چاہتا ہے۔ پروین اپنے نام آنے والے خطوط کے جواب نہیں دیا کرتی تھی، اِس مرتبہ اُس نے نہ صرف قیدی کے خط کا جواب دیا بلکہ پولیس کے ایک اے ایس پی کی مدد سے اپنی کتاب بھی پہنچوا دی۔ ایک مرتبہ پروین نے دیگر ادیبوں کے ہم راہ چین میں پندرہ روز گزارے۔ دیگر ادیبوں میں ایک تاثر پایا جاتا تھا کہ پروین مقبول شاعرہ، سرکاری عہدے دار اور اپنی اُفتادِ طبع کے باعث لیے دِیے رہتی ہے اور لوگوں سے تکلّف برتتی ہے۔ ایک روز بیجنگ کے ہوٹل میں قیام کے دوران اُس نے عطاء الحق قاسمی صاحب کو قمیص استری کرتے دیکھا تو باقاعدہ ناراض ہو کر اُن سے قمیص چھین لی اور بولی ”بہن کی موجودگی میں بھائی کہ کام کرتے اچھے نہیں لگتے۔“ بعد ازاں اُس نے عطا صاحب کو اُن کی قمیص استری کر کے دی۔ عطا صاحب پروین

کی پرخلوص، پاکیزہ محبت سے اِتنے متاثر ہوئے کہ بعد میں ایک جگہ پروین کو یاد کرتے ہوئے کہا ’’پروین شاکر ایک لبرل ترقی پسند خاتون ہونے کے باوجود مشرقی تہذیب اور روایات کی پاس داری کرتی تھی۔‘‘

شکیل عادل زادہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کسٹم افسر حسن امام مرحوم کے گھر ایک مشاعرے میں مدعو تھے۔ مشاعرہ شروع ہو چکا تھا اور پروین شاکر کو بھی آ کر اپنا کلام سُنانا تھا۔ سامعین بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ اِتنے میں پروین اپنے شوہر ڈاکٹر نصیر علی کے ہمراہ تقریب گاہ میں داخل ہوئی تو ہر سُو بھنبھناہٹ ہونے لگی اور بلند ہوتی گئی۔ پروین راستے میں کھڑے لوگوں کے بیچ سے گزری تو لوگوں نے نازیبا، ناپسندیدہ آوازے کسے۔ ان میں واضح طور پر پروین اور اُس کے شوہر کے بارے میں طنزیہ جملے شامل تھے۔ پروین اور نصیر خاموشی اور بُردباری سے وہاں سے گزر گئے۔ البتہ شکیل صاحب اور دیگر سنجیدہ، بامروّت ادیبوں کو یہ سب کچھ بہت ناگوار محسوس ہوا۔ ایسے میں پروین اور نصیر کے دل پر جانے کیا گزرتی ہوگی۔ وہ بہت پیاری اور حسّاس لڑکی تھی، ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہوگی۔ شکیل عادل زادہ کہتے ہیں ’’اُس کا ہمارے گھر آنا جانا خوب تھا۔ ہمارے گھر بھی زیادہ دُور نہیں تھے۔ عرصے بعد اسلام آباد میں اہلِ قلم کانفرنس کے ٹھہرانے پر میریٹ ہوٹل میں آمنا سامنا ہوا۔ اُس نے مجھے اور میں نے اُسے دیکھا تو والہانہ ایک دوسرے کی جانب بڑھے۔ میرے بازو بے اختیار پھیل گئے۔ پروین بھی بے اختیار میرے گلے سے آلگی اور تجسس و تردّد سے بیٹی کو پوچھنے لگی ’’دل کش کیسی ہے؟‘‘ اور سب گھر والوں کا بھی فرداً فرداً احوال دریافت کیا۔ پروین کے اِس بے ساختہ، بے محابا اِظہار پر اِرد گرد موجود ادیبوں اور شاعروں کو حیرت ہوئی اور مرحوم جمال احسانی نے پروین کے کچھ آگے چلے جانے کے بعد کہنی مارتے ہوئے شوخی سے پوچھا کہ یہ کون ساہُنر ہے، کچھ ہمیں بھی تعلیم دیجیے۔ شکیل صاحب نے مسکرا کے کہا ’’تم نہیں سمجھو گے۔ یہ آنکھ اور نیت کی بات ہے۔‘‘

شکیل صاحب پروین کے ذکر پہ خوش گوار یادوں میں کھو جاتے ہیں۔

اُس کی بڑی بہن نسرین، پروین کو حسرت آمیز لہجے میں یاد کرتے ہوئے ایک جگہ بتاتی ہے:

''پروین ابّا ہی کی طرح معصوم تھی۔ بہت جلد دوسروں پر بھروسا کر لیتی تھی۔ اُس نے دھوکے بھی کھائے۔ ابّا اور امّاں دونوں کی عادتیں اُس نے لے لی تھیں۔ ابّا کی طرح بے نیازی اور کاہلی، چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے کا انداز بالکل ابّا کی طرح تھا۔

ممتاز مفتی انوکھے آدمی تھے اور منفرد سوچ کے مالک، سو وہ اپنے مخصوص انداز میں ایک مرتبہ پروین شاکر کے بارے میں کہنے لگے ''پروین شاکر کی بدقسمتی ہے کہ وہ نواز دی گئی ہے۔ جو نوازے جاتے ہیں اُن پر اکلاپا مسلط کر دیا جاتا ہے، ذاتی خوشی چھین لی جاتی ہے۔

اُس کی قریبی، بہن جیسی سہیلی اور پُرشفقت شخصیت پروین قادر آغا نے بیان کیا تھا ''پروین شاکر دوسروں سے منفرد اور بلند تھی۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ اِتنی کم عمری میں اپنی شاعری کی یہ دولت اُس نے جو شہرت حاصل کی، اُسے کتنی بُردباری سے اپنے اندر جذب کر لیا۔''

بعض لوگ پروین کی بُردباری کو اُس کے غرور سے تعبیر کرتے۔ البتہ ایک جگہ وہ خود لکھتی ہے ''میری خامیوں میں سے ایک خامی یہ ہے کہ میں کم گو اور کم آمیز ہوں۔''

بمبئی میں ایک لڑکی کینسر کے مرض میں مبتلا تھی۔ وہ پندرہ سال کی تھی۔ اُس کی انگریزی نظموں اور ڈائری پر مشتمل مجموعہ ''گیتا نجلی البم'' کے نام سے پہلے لندن اور بعد ازاں ہندوستان سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں ''پندرہ سال کی اس معصوم بچی کی نظموں کا نیا پیغام تھا اور موت کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔ کوئی اور نہ مرے، اِس عمر میں نہ مرے، اس طرح نہ مرے۔'' گیتا نجلی کے دل کی آواز پروین کی رُوح کو چھو گئی۔ وہ ان نظموں کا ترجمہ کرنا چاہتی تھی، دوسرے دیس کی ایک معصوم بچی کی ابتلا میں وہ اُس کے ساتھ تھی۔ جلد ہی اُس نے لڑکی کی منتخب نمائندہ نظموں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا۔ گیتا نجلی کی نظموں اور ڈائری کے اقتباسات (مترجم احمد سلیم) کو پڑھیں تو انسان پر عجیب اثر ہوتا ہے، جس عمر میں لڑکیاں محبت کرنے کا سوچتی ہیں، گیتا نجلی مرنے کا

اہتمام کر رہی تھی۔ایک حقیقت کو دو مختلف پہلوؤں سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

پروین کی زندگی میں شگفتہ لمحات کی بھی کمی نہ تھی۔

کراچی میں حالات کی خرابی کے باعث کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ پروین نے ایک واقعہ اپنے کالم ''گوشۂ چشم'' میں لکھا:

''ابھی پچھلے دنوں ایسے ہی ایک مشاعرے سے واپسی پر افتخار عارت اور اظہر عباس ہاشمی دھر لیے گئے۔''اِتنے رات گئے آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟''،''گھر جا رہے ہیں''،''یہ گھر جانے کا کون سا وقت ہے؟''افتخار عارف نے اپنے شعر کی مار دینا چاہی''شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے۔''اُس ظالم نے نہ ٹی وی پروگرام''کسوٹی'' دیکھا تھا،نہ''ماہِ دو نیم'' پڑھی تھی اور نہ ہی ''حرفِ باریاب'' پر ایک سو ساٹھ تبصرے پڑھے تھے۔سو اُس نے دونوں کو خوب ٹھوک بجا کر دیکھا۔جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ دونوں''دہشت گرد''نہیں''دہشت زدہ'' ہیں تو جان بخشی کی۔''

ایک روز کا دل چسپ ماجرا ہے، پروین اپنے دفتری کام میں مصروف تھی، پچھلے دِنوں بیماری کی وجہ سے چھٹی کی تھی، اس کا تمام کام اکٹھا ہو چکا تھا۔کاغذات کے پلندے اور فائلوں کے انبار میز پر دھرے تھے۔ اِتنے میں اُسے اطلاع ملی کہ اپنے وقت کی ایک حسین اور مقبول فن کارہ اُس سے ملنے آئی ہے۔ پہلے تو پروین نے سوچا کہ کام کی زیادتی کے باعث اُسے ٹال دے پر ایسا کرنا اچھا نہ لگا۔اُسے اندر بلا لیا۔اُس فن کارہ کو شادی کے اٹھارہ برس بعد گھر سے نکال دیا گیا تھا اور بچوں کو چھین لیا گیا تھا۔ یہ سب سناتے ہوئے رو رہی تھی۔ جب اُس نے کہا پروین اِتنے ظلم وستم کے باوجود جب میرا شوہر مر گیا تو میں مگر مچھ کے آنسو روئی تھی'' (اُس کا مطلب تھا کہ وہ بہت روئی تھی مگر پروین کے سامنے محاورے کا غلط استعمال کرتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ دکھاوے کے آنسو روئی تھی)۔اس سے پہلے کہ پروین اپنے قہقہے پر قابو نہ رکھ پاتی، وہ معذرت کر کے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔وہ باہر تب آئی جب خود پر قابو پا لیا۔ یوں اُس کی رگِ شرارت جاگ اُٹھتی تھی۔

وہ ہندوستان کے دورے پر گئی تو ہوٹل میں قیام کیا۔ وہاں اُس کی ملاقات اپنی سہیلی رفاقت سے طے تھی۔ اس سے پہلے شاعرہ شبنم شکیل، رفاقت کو اس کی دو پریشانیوں سے آگاہ کر چکی تھی۔ پہلی پریشانی یہ تھی کہ پروین اپنے بیٹے مراد کو اپنے ہم راہ لائی تھی اور وہ بیٹے کو ہوٹل کے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اُس نے علی گڑھ یونی ورسٹی میں مشاعرے کی دعوت قبول کر لی تھی مگر اُس کے پاس وہاں کا ویزا نہ تھا۔

پس رفاقت نے اُسے اپنے گھر منتقل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ یوں اُس کا مراد والا معاملہ حل ہو گیا اور ایک ماں کا بیٹے کے حوالے سے تفکر ختم ہوا۔

علی گڑھ کے مشاعرے میں شرکت کا مسئلہ بھی حل ہو ہی گیا۔ علی گڑھ میں پروین کو یونی ورسٹی دیکھنے کا زیادہ اشتیاق تھا۔ یونی ورسٹی دیکھنے کے دوران اپنی شُستہ اور شگفتہ تحریر کی وجہ سے پہچانے جانے والے، علی گڑھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے سابق سربراہ تاریخ ساز ادیب رشید احمد صدیقی کا گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُن کا گھر محفوظ کر لیا گیا تھا۔ وہ پانچ مرلے کا، صاف سُتھری زندگی کا آئینہ دار، سادہ سا گھر تھا۔ اُس شام مشاعرے میں شریک شرکاء و سامعین کو دیکھ کر پروین کو اُن میں اپنا پن محسوس ہوا۔ وہ دھیمے مزاج کے متین لوگ تھے۔ پروین نے مشاعرے کے بعد رفاقت سے افسوس کا اِظہار کرتے ہوئے کہا ''ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ دھیما پن اور نرمی ولحاظ جیسی خوبیاں ہم سے روٹھ گئی ہیں۔''

پروین کو معروف مصوّر ایم ایف حسین سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ وہ خداداد صلاحیت کے مالک جدید دور کے بڑے مصوّر تھے۔ وہ ہر محفل میں ننگے پیر شریک ہوتے تھے اور ایک جواں سال حسینہ اُن کی بغل میں ہوتی تھی۔ وہ معروف بھارتی اداکارہ مادھوری ڈکشٹ کے بھی عاشق صادق تھے اور اُس کی مختلف انداز میں درجنوں تصاویر بنا چکے تھے۔

دراز قامت، چوڑے، لمبے ہاتھ پیر والے، سفید دھوتی کُرتے میں ملبوس ایم ایف حسین ننگے پیر گھر کے صدر دروازے پر پروین کے منتظر تھے۔ وہ پروین اور اُس کی سہیلی کو اندر لے گئے

جہاں ایک حسین خاتون نے اُن کا استقبال کیا، سادہ پانی پیش کیا، چائے کے ساتھ اچار اور مَٹھیاں لے آئی۔ پروین خاصی دیر تک اُن کے پیر دیکھتی رہی جو بغیر جوتوں کے چلنے کے عادی ہونے کی وجہ سے خاصی بُری حالت میں تھے۔ حسین صاحب محافل، تقریبات، بازاروں، محلوں اور سفر میں ننگے پیر ہی جاتے تھے۔ وہ اور پروین خاصی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ آخر طویل خاموشی کے بعد پروین نے اُن کے فن کی تعریف کرنا شروع کی۔ وہ خاموشی سے سُنتے رہے۔ چائے کے بعد وہ اُنھیں چھوڑنے باہر تک آئے، الوداعی سلام کیا اور لوٹ گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر پروین نے چہکتے ہوئے کہا کہ اُس میں اور ایم ایف حسین صاحب میں ایک شے مشترک ہے۔ اُس کا اِشارہ ننگے پیروں کی جانب تھا۔ پروین بھی اپنے جوتوں کے بارے میں خاصی بے پروا تھی اور اُنھیں کہیں اُتار کر اکثر بھول جاتی تھی اور اُسے واپس ننگے پیر آنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ تو وہ اسلام آباد کی جناح سپر مارکیٹ میں ننگے پیر گاڑی چلاتی ہوئی آئی اور وہیں بیٹھے بیٹھے جوتوں کی دُکان سے چپل خرید کر پہنی۔

پروین دِلّی کی معروف ادب شناس کامنا پرشاد، جو خوشونت سنگھ کی بھی دوست تھی، سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ اُردو شاعری کی شائق اور پروین کی شاعری کی مداح تھی۔ اُس نے پروین کی کئی نظموں اور غزلوں کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا تھا۔ کامنا کا چھوٹا سا گھر ہندوستانی ثقافت کا مرقع تھا۔ وہ راجھستانی پہناوے میں تھی، عنابی اور سیاہ رنگ کا کڑھائی کیا ہوا گھاگرا، چھوٹی سی بے پردہ چولی، لمبے کُھلے بال اور ناک میں راجھستانی کیل پہنے وہ پروین سے بہت گرم جوشی سے ملی۔ گھر میں چاندی کے گلاسوں میں پانی پیش کیا جاتا اور فرشی نشست کا اہتمام ہوتا تھا۔ دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے دھرے تھے۔ اُس نے سہگل نام پکارا تو ایک بیس سالہ لڑکا، مُنہ میں پان کی گلوری دبائے بے تکلفانہ اندر چلا آیا۔ وہ کامنا کا منگیتر تھا اور عمر میں اُس سے بہت چھوٹا تھا۔ کامنا نے بتایا کہ وہ اور سہگل بہت جلد، والدین کی مرضی کے برخلاف بیاہ رچانے والے ہیں۔ کامنا نے پروین کو

یہ بھی بتایا کہ وہ پروین کی طرح نسوانی آزادی کی حامی ہے۔ پروین نے اُس کی تصحیح کرتے ہوئے وضاحت کی کہ کامنا اُس کی شاعری کو غلط سمجھی ہے۔ پروین نسوانیت کا تذکرہ مخصوص حدود میں کرتی ہے(غالباً پروین مادر پدر آزادی سے اپنی شاعری کے سمبندھ کو غیر متعلقہ اور گم راہ کُن سمجھ رہی تھی)۔کامنا کی بقیہ گفت گو کے دوران پروین خاموش رہی۔تکرار و کج بحثی اُس کے مزاج کے خلاف تھی۔ پروین جس راہ سے اخلاقیات کا جنازہ گزرتا دیکھتی، اُس رستے سے ہٹ جاتی۔سو اُس کا کامنا سے رابطہ رسمی سا ہوتا ہوا معدوم ہوگیا۔اُس کی نسوانیت تو رنگوں کی بھیگی پھوار تھی، مقامی ذائقے میں رچی اور روایات کی خوشبو سے مہکتی ہوئی۔اُس کی کئی نظموں پر رقاصہ پُشپا ڈوگرا نے کتھک رقص بھی ترتیب دیا تھا جس میں ایک نرالی نظم یوں ہے:

بسنت بہار کی نرم ہنسی
آنگن میں چھلکی
بھیگ گئی مری ساری

پھر
پُروا کی شوخی!
کیسے اپنا آپ سنبھالوں
آنچل سے تن ڈھانپوں۔تو
زلفیں کھل جائیں
زلف سمیٹوں، تن چھلکے گا

عشق پیشہ، خوش فکر، خوش کلام، ماہ جبیں پر ایسا گرہن آیا کہ اُس کی تابانی چُرا لے گیا۔

وہ اور اُس کا شوہر، دونوں عمدہ انسان تھے، پس ایک دوسرے سے مختلف تھے، اِک دوجے کے لیے نہ تھے۔مزاج و فکر کا تفاوت زندگی پر حاوی ہوگیا۔ باہر شہرت کے ڈنکے تھے اور گھر میں اُداسی اور حُزن آلود خاموشی تھی۔

پروین سے سچی جھوٹی باتیں وابستہ ہوتیں تو نصیر کا دِل دُکھتا۔ پروین کے والد شاکر حسین نے تو واضح طور پر اُس سے کہہ دیا تھا کہ وہ شاعری سے دُور رہے وگرنہ اُس کی خانگی زندگی کو بربادی اور بیٹے کی پرورش کو حسرت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

پاکستانی معاشرے میں ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کے علاوہ معاشی مسائل بھی بہت سی شادیوں میں دیمک لگا دیتے ہیں۔ پروین کو نصیر کی جامد طبیعت بھی کھلتی تھی۔

اِدھر اُدھر نصیر کو ایسی صورت میں کہ پروین اسلام آباد میں ہو اور وہ کراچی میں، شادی کی بنیاد صاف طور پر متزلزل نظر آتی تھی۔ ایسے کھنچاؤ کے حالات میں پروین نے کراچی سے دُور اسلام آباد جانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنا تبادلہ دارالحکومت میں کروا لیا۔ اُس نے زندگی کو نئے سِرے سے ترتیب دینے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے اُس نے ہیئت بدلی۔ ساڑھی پہننا چھوڑ دی، بال کندھوں تک ترشوا لیے اور لباس کا انداز بدل دیا۔

نصیر علی نے پروین سے شادی کا بندھن برقرار رکھنے کے لیے ایک ملاقات اکتوبر 1986ء میں کی مگر دونوں باہمی رضا مندی اور مصالحت کی شرائط پر آمادہ نہ ہو سکے۔ نصیر کی شرائط میں ایک یہ تھی کہ پروین شاعری چھوڑ دے۔ شاعری پروین کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتی تھی اور اُس کے لیے لازم و ملزوم تھی۔ اُس کی پہچان شاعری تھی۔ نصیر کی دوسری شرط یہ تھی کہ پروین ملازمت چھوڑ کر گھریلو زندگی بسر کرے۔ پروین زندگی کے سفر میں بہت آگے جا چکی تھی، معاشی طور پر خود مختار ہو چکی تھی اور ایک باعزت ملازمت سے منسلک تھی۔ اُس کے لیے اُلٹے قدموں واپسی کا سفر محال تھا۔

اُس نے پروین سے آخری ملاقات فروری 1987ء میں کی جس کے بعد دونوں میں باہمی رضامندی سے گیارہ برس کی شادی کے بعد طلاق ہو گئی۔ طلاق کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ پروین دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی۔ بہ صورتِ دیگر اُسے اپنے بیٹے مراد (گیتو) کی تحویل سے دست بردار ہونا پڑتا تھا۔

اس کے برعکس نصیر دوسری شادی کے لیے آزاد تھا۔ (آئندہ دِنوں میں اُس نے دوسرا بیاہ کیا جو کام یاب رہا اور وہ صاحبِ اولاد بھی ہوا (حال ہی میں اُس کا انتقال ہوا ہے۔ اُس کا اپنے بیٹے مراد سے باقاعدہ رابطہ دمِ آخریں تک رہا)۔

پروین نے اپنے آپ کو تعلیم میں مگن کر کے توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ اُسے عمدہ تعلیمی ادارے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا جنون بھی تھا۔ اُس نے فُل برائٹ اسکالرشپ حاصل کی اور امریکا کہ ہارٹ فورڈ یونی ورسٹی کینیکٹک روانہ ہوگئی۔ اُس کا داخلہ معروف درس گاہ ہارورڈ یونی ورسٹی میں بھی ہوگیا تھا لیکن اُس نے اسے عارضی طور پر مؤخر کر دیا۔

ایک موقع پر کورس کے حصّے کے طور پر پاکستانی فلم کا انگریزی ترجمے کے ساتھ دکھایا جانا شامل تھا۔ پاکستانی سفارت خانہ اس کا انتظام نہ کرسکا۔ وہاں کے ہندوستانی طلبہ نے تجویز پیش کی کہ ہندوستانی فلم دکھا دی جائے۔ پروین نے تجویز کی بھرپور مخالفت کی۔ اُس کی خواہش تھی کہ امریکی پاکستانی اور بھارتی ثقافت کو علیحدہ طور پر پہچانیں۔ یہ اصرار اُس کے جذبۂ قومیت کا عکاس تھا۔

1990ء میں اُسے صدارتی تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا گیا جس کے لیے وہ اپنے کورس کے بیچ میں بیٹے کے ہم راہ پاکستان واپس آئی۔ وہ اُس روز حقیقی طور پر خوش نظر آ رہی تھی۔

1992ء میں اُسے امریکا میں اپنے والد کی علالت اور پھر وفات کی اطلاع ملی۔ صدمے کی وجہ سے اُس کے حواس پر شدید منفی اثر ہوا۔ اُن دِنوں وہ خود علالت کی وجہ سے بوسٹن کے ایک اسپتال میں زیرِ علاج تھی لہٰذا والد کے جنازے میں شریک نہ ہوسکی۔

امریکا سے واپسی پر اُسے اسلام آباد میں ایک ایسا گھر الاٹ ہوا جس کے ساتھ سبزے کا قطعہ تھا۔ اُسے وہاں اِرد گرد سبزے، بُوٹوں اور پھولوں کی مہک بہت بھلی لگتی تھی۔

پروین شاکر جوتشی چوہان کی وہ پیش گوئی غلط ثابت کرنا چاہتی تھی جس میں اُس نے اس کی چار کتابوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اُس نے ''ماہِ تمام'' کے نام سے کلیات چھپوانے کا اہتمام کیا۔ گویہ

پانچویں کتاب نہ تھی مگر پروین کے ذہن کے مطابق کلیات کی شکل میں ایک کتاب ضرور تھی۔

''ماہِ تمام'' کے معنیٰ ''اختتام'' کے لیے گئے تو اُس نے وضاحت کی کہ اس کا مطلب چاند کا عروج ہے۔ جب اُس کے اُستاد اسلم فرّخی کے صاحب زادے آصف فرّخی نے اِس نام پر اعتراض کیا تو وہ باقاعدہ ناراض ہوگئی۔ رفاقت جاوید نے ایک دسویں محرّم کا احوال لکھا ہے جب پروین شاکر نے اُن کے ہاں قیام کیا تھا۔

''رات خاموش تھی، سب سو چکے تھے کہ مجھے ایک دم سے ایک پُرسوز نسوانی آواز نے چونکا دیا۔ یہ خوب صورت آواز پروین کی تھی، وہ دُکھ میں سو نہ سکی تھی اور اپنے جذبات کا اِظہار تڑپا دینے والے نوحے ''گھبرائے گی زینب'' سے کر رہی تھی۔ دُکھ و درد میں ڈوبی ہوئی آواز کا اُتار چڑھاؤ کسی صورت ناصر جہاں کی آواز سے کم نہ تھا۔ اُس کی شخصیت کا یہ روپ مجھ پر آج عیاں ہوا تھا۔ میں دیر تک اُس کی آواز میں کھوئی رہی۔ کافی دیر بعد اُس کی آواز قدرے مدّھم پڑ گئی۔ اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ کچن کی طرف چلی گئی غالباً اُس نے اپنے لیے چائے بنائی تھی۔ رات بھر وہ سو نہیں پائی تھی، صبح دیر تک سوتی رہی۔ جب وہ سو کر اُٹھی تو اُس کی آنکھوں میں لال ڈورے اُس کی رات بھر بے داری اور اشک باری کی غمازی کر رہے تھے۔''

25 دسمبر 1994ء کو سرکاری دفاتر میں چھٹی تھی۔ پروین اپنے بالوں میں مہندی لگایا کرتی تھی۔ اُس روز بھی اُس نے مہندی لگائی اور گھر کے کام نمٹائے۔ رات بھر بارش ہوتی رہی۔

اگلی صبح اُس نے سبز رنگ کا لینن کا سُوٹ زیبِ تن کیا، کالے رنگ کی جوتی پہنی اور کالے رنگ کا پرس تھاما اور صبح نو بجے دفتر جانے کے لیے گاڑی میں آ بیٹھی۔

پروین کی عادت تھی کہ وہ پہاڑ کے ساتھ چلنے والی مارگلہ روڈ پر سفر کرتی ہوئی دفتر جایا کرتی تھی۔ یوں یہ خوب صورت سفر خوش گوار دن کا پیغام ثابت ہوتا تھا۔

اُس روز لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے رستے کے اشارے بند تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ جب وہ فیصل مسجد کو جانے والی سڑک اور مارگلہ روڈ کے سنگم پر پہنچی تو فیصل مسجد کی جانب سے ایک بس

تیز رفتاری سے آئی جسے اُس کا کلینر چلا رہا تھا۔وہ بس پروین کی چھوٹی نیلے رنگ کی کار سے زوردار دھمک سے ٹکرائی اور کار کو دھکیلتی ہوئی سڑک کے پار لے گئی۔بس ڈرائیور کی جانب سے کار کو ٹکرائی تھی سو کار ڈرائیور موقع پر دم توڑ گیا۔پچھلی سیٹ پر بے ہوش اور زخمی پروین نیم دراز تھی۔اُس کے پیروں میں اُس کی بیاض کھلی پڑی تھی اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔لوگ اکٹھے ہو گئے۔وہ پروین کو پہچان نہ سکے تھے۔اُنھوں نے ایک راہ گزرتی وین کو رُکنے کا اِشارہ کیا اور خاتون کو وین میں لٹایا۔ وین کے ڈرائیور نے خاتون کے بیگ سے تعارفی کارڈ نکالا تو اُس پر ''پروین شاکر'' لکھا دیکھ کر دہل گیا۔

اِدھر اسلام آباد کے ایک گوشے میں رقصِ اجل جاری تھا، اُدھر ایک اور گوشے میں واقع دفتر میں پروین کی عزیز ترین ہم درد سہیلی پروین قادر آغا کو دس بج کر بیس منٹ پر پروین کے بیٹے مراد کا فون آتا ہے۔ وہ گاڑی اور ڈرائیور مانگتا ہے۔اُس روز اُن کا ڈرائیور ایک شادی کے انتظامات میں مشغول ہوتا ہے، لٰہذا وہ معذرت کر لیتی ہے۔مراد گلوگیر لہجے میں اُنھیں اپنی امی کے حادثے کا بتاتا ہے۔ پروین قادر آغا کا دل دہل جاتا ہے۔وہ پریشان ہو کر سوچتی ہیں کہ کہیں پروین شاکر کو زیادہ چوٹیں نہ آئی ہوں۔ وہ اسپتال کی جانب لپکتی ہیں۔ وہاں شعبۂ حادثات میں اُس وین کا ڈرائیور موجود ہوتا ہے جو زخمی پروین کو اسپتال لایا ہے۔وہ پروین قادر آغا کو بتاتا ہے کہ کار ڈرائیور فوت ہو گیا ہے۔ یہ سُن کر اُن کی ٹانگوں سے جان نکل جاتی ہے۔اچانک سامنے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے، اسٹریچر پر پروین کو لایا جاتا ہے اور اُسے ایکسرے روم کی جانب لے جایا جاتا ہے۔ اِتنے میں معصوم مراد (گیتو) ٹیکسی پر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔وہ اپنی امی کے لیے بے حال ہو رہا ہے۔

آپریشن تھیٹر کے ڈاکٹر مراد کی امی کو پہچان نہیں پائے اور جب اُنھیں بتایا جاتا ہے کہ وہ پروین شاکر ہے تو وہ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ پروین کے سر میں شدید ضربیں آئی ہیں اور ناک مُنہ سے خون بہہ رہا ہے۔

اِتنے میں ایک نرس باہر آتی ہے اور پروین قادر آغا کے ہاتھ میں پروین کے ناک کی لونگ اور کلائی کی گھڑی رکھ جاتی ہے۔ وہ ہکّا بکّا کھڑی ہیں۔ اِتنے میں وہی وین کا ڈرائیور آتا ہے اور کہتا ہے ''وہ نہیں رہی، چل بسی'' پروین قادر آغا کا بیٹا ڈاکٹر جہاں زیب بھی وہاں پہنچ چکا ہے اور ماں سے نظریں چرا رہا ہے۔ پروین شاکر کی موت کی اطلاع شہر بھر، ملک بھر اور دُنیا بھر میں آناً فاناً پھیل جاتی ہے۔

دُنیا کے لیے وہ پروین شاکر ہے، مراد کی توامی ہیں۔

مراد کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ وہ سبھی بچے جن کی جوان مائیں مر جاتی ہیں، شروع میں تو اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

پروین شاکر کی ماں اور بہن کراچی سے اسلام آباد پہنچ جاتی ہیں۔ اُن کے دل دوز بین دِلوں میں چھید ڈالتے ہیں۔ ماں پکارتی ہے ''پارو! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ میری پارو! تم خاموش کیوں ہو؟ جواب دو، مجھ سے باتیں تو کرو۔''

جنازہ اُٹھتا ہے تو گھن گرج سے بارش شروع ہو جاتی ہے، بالکل ویسی ہی بارش جیسی پارو کی پیدائش کے وقت ہوئی تھی۔

❁❁❁❁❁

ایک تھی پارو

فرحت پروین ملک نے اپنے اِس خاکے میں چند باتیں دوسرے خاکہ نگاروں سے ذرا مختلف لکھی ہیں۔گو عشق کی کہانی تو وہی ہے جو دوسروں نے لکھی ہے،لیکن یہ پہلے یا دوسرے یعنی جنونی اور حقیقی عشق کی بحث میں نہیں پڑی بلکہ ایک ہی محبت کا ذکر کیا ہے اور اسے پہلی محبت کہا ہے اور محبوب کا نام بھی بتایا ہے۔جس بارے دوسرے لوگ گریز کرتے رہے یا اُنھیں خبر نہیں تھی۔محترمہ فرحت پروین ملک لکھتی ہیں:

> ”اُس کی پہلی محبت اسد اشرف ملک تھے۔اسد اشرف ملک کے گھر سے پروین کے لیے رشتہ بھی آیا،مگر اُس کے والد شاکر مرحوم نے انکار کر دیا اور اس کی وجہ صرف مسلک کا مختلف ہونا نہیں تھا بلکہ والد مرحوم کو یہ رنج تھا کہ اب پروین اپنا رِشتہ خود بھیجنے لگی۔“(ص55)

یعنی باپ کی اَنا جیت گئی،بیٹی ہار گئی اور مشرقی روایات کی بھینٹ چڑھ گئی۔

پروین شاکر کی ڈاکٹر نصیر سے شادی ہوگئی تو فرحت پروین ملک نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں (جو مراد کی پیدائش سے بھی پہلے ہوئی تھی) پروین سے کہا:

> ”تمھیں رشتہ دار سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ڈر ہے تمھاری سسرال والے تمھاری شاعری کو کہاں تک برداشت کریں گے۔شاعری اور شادی کو قائم رکھنا مشکل نہ ہو جائے۔“ (ص43)

اللہ نے عورتوں کو بھی عجیب شعور بخشا ہے۔سرفراز اقبال نے 1978ء میں پروین شاکر کی اکیلی دُلہن بنی ہوئی تصویر دیکھ کر بہت کچھ سمجھ لیا اور فرحت پروین ملک نے ایک ملاقات ہی میں مستقبل کے خدشات کو بھانپ لیا۔وہ بھی اُن دِنوں جب اُس کی شادی کو ابھی صرف دو تین برس ہوئے تھے اور وہ بظاہر خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔بہرحال دونوں

کے خدشات درست ثابت ہوئے۔شاعری اور شادی ایک ساتھ نہ چل سکے اور آخر کار گیارہ برس بعد طلاق ہوگئی۔

ایک بات اور، سرفراز اقبال نے لکھا ہے کہ طلاق کے بعد وہ جس شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی اُس کے بچے نہیں مان رہے تھے۔مگر فرحت پروین ملک نے اُس کی دوسری شادی کا ذکر کیا ہے۔کسی اور خاکہ نگار یا صاحبِ کتاب نے اِشارتاً بھی یہ بات نہیں لکھی مگر فرحت پروین ملک نے لکھا ہے:

''پروین شاکر کی دوسری شادی بھی دو ماہ میں ختم ہوگئی۔اُس آدمی نے (مصنّفہ نے آدمی کا نام نہیں بتایا) پارو پر مقدمہ کر دیا۔۔۔۔جمیل الدین عالی نے مقدمہ اپنے اثر ورسوخ سے ختم کروِیا۔یہ بات عالیؔ مرحوم نے فون پر مجھے بتائی۔''(ص 57)

محترمہ فرحت پروین ملک نے عالیؔ مرحوم سے سُن سُنا کر یہ بات لکھی ہے۔کسی اور ذرائع سے اِس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ویسے بھی طلاق کے وقت جو شرائط طے ہوئی تھیں اُن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ پروین شاکر دوسری شادی نہیں کرے گی، ورنہ اُسے اپنے بیٹے مراد کی تحویل سے دست بردار ہونا پڑے گا اور پروین کو بیٹے سے مستقل جدائی برداشت نہیں تھی۔وہی تو اب اُس کی زندگی کا اثاثہ تھا۔اِس لیے اس سے دست بردار ہونے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔اِس بنا پر دوسری شادی کا یہ قصّہ صحیح نہیں لگتا۔ایک اور بات بھی ہے کہ اُس کے ''مہربان'' جو اُس کی چھوٹی سے چھوٹی کوتاہی کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اور اُس پر کیچڑ اُچھالنے کا کوئی موقعہ ضائع نہیں کرتے، اِتنی بڑی بات پر کیسے خاموش رہے؟ چونکہ اِس حوالے سے کوئی بات سُنائی نہیں دی، اِس لیے دوسری شادی کے قصّے کو ماننا ذرا مشکل ہے۔

فرحت پروین ملک مزید لکھتی ہیں کہ:

''پروین شاکر ہمیشہ افواہوں کی زد میں رہی۔جنگ اخبار اُس کی تصاویر اِس انداز سے شائع کرتا جیسے وہ شاعرہ نہیں بلکہ فلم اسٹار ہے۔''(ص 53)

اِس کے پیچھے مقصد کیا تھا؟ کیا یہ اُس کی پبلسٹی کا عمل تھا یا کسی نیّت کا فتور؟ سمجھنے کی بات ہے۔مصنّفہ

مزید لکھتی ہے کہ:

''اگر وہ کسی سے ملنے سے انکار کرتی ہے لوگ اُسے مغرور اور بد دماغ کہتے۔ اگر کسی سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تو اُس کا اسکینڈل بنا دیا جاتا۔ دراصل لوگ اُس کی شاعری کے کردار کو خود سے منسوب کر لیتے اور اُس کی چاہت میں مبتلا ہو جاتے۔ ہمارا معاشرہ رائی کا پہاڑ، پر کا کوّا بنانے میں ماہر ہے۔'' (ص53)

مرد حضرات تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو لکھنے والیاں، خاص طور پر پروین شاکر جیسی شاعرات جو شاعری میں خواتین کی فطری خواہشات کا اظہار کر رہی ہیں، گھر سے کسی مرد ہی کی تلاش میں نکلی ہیں، اور وہ مرد ہم ہی تو ہیں۔ مگر مقصد میں رسائی نہ ہونے سے کبھی بد دماغی کے طعنے، کبھی اسکینڈل اور رائی کا پہاڑ اور پر سے کوّے بنانے کا عمل، مرد کی سائیکی اور ذہنیت کی بھرپور عکاسی ہے۔ فرحت پروین ملک کہتی ہیں کہ:

''ہمارے گھر جو بھی شاعر، ادیب ہوتے وہ اُس کی شاعری پر کم، شخصیت کے عیب و ہُنر پر ضرور تبصرہ کرتے۔'' (ص56)

اِس عیب و ہُنر پر تبصرے میں حسد اور انتقام کی چنگاریاں سُلگتی صاف نظر آتی ہیں۔ فرحت پروین ملک نے بہت سی باتوں کا برملا ذکر کیا ہے۔ یہ باتیں بنانے والوں میں سینئر اور جونیئر دونوں قسم کے شاعر اور ادیب موجود ہیں بلکہ بعض خواتین کا حسد بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ نظیر صدیقی صاحب نے ''خوشبو'' کے حوالے سے ایک مضمون لکھا جو ''فنون'' میں شائع ہوا تو ساقی فاروقی صاحب نے یوں گِلہ کیا:

''پچیس سال کی لڑکی پر تم پچیس صفحات کا مضمون لکھتے ہو، میرے لیے تمھارے پاس وقت نہیں۔'' (ص45)

ضیاء جالندھری صاحب نے فرحت پروین ملک سے پوچھا:

''یہ مضمون کیا آپ کی اجازت سے لکھا گیا؟''

''اجازت کیا، میری خواہش پر لکھا گیا۔''

''واقعی؟'' ضیاء جالندھری نے حیرت سے کہا۔'' (ص46)

یہی نہیں، ضیاء جالندھری صاحب نے پی۔ٹی۔وی اسلام آباد سنٹر کے مشاعرے کی فہرست بنائی اور پروین شاکر کو نظر انداز کر دیا۔ پوچھنے پر بتایا:

''وہ بہت مغرور لڑکی ہے ۔ میں کراچی گیا تھا۔ اُس نے ملنے سے انکار کر دیا۔''(ص46)

ضمیر جعفری مرحوم نے مصنّفہ سے پوچھا:

''پروین شاکر کی شاعری کا Source of Inspiration کیا ہے؟

مصنّفہ کو اُن کا سوال اچھا نہیں لگا۔ احتراماً صرف اِتنا کہا:

''میں شعر نہیں کہتی، مجھے نہیں معلوم۔ مگر یہ ضرور جی چاہا، پوچھوں: ''یہ سوال آپ نے کتنی شاعرات سے کیا ہے؟ یہ نظرِ کرم صرف پروین شاکر پر کیوں؟ (ص47۔48)

ان سینئرز کے ساتھ ساتھ جونیئرز کا رویّہ اور حسد بھی دیکھ لیں۔ کراچی سے پروین شاکر کی ایک ہم جماعت مصنّفہ کے گھر آئی۔ مصنّفہ نے کہا:

''پروین کمال لڑکی ہے۔''

اُس نے نہایت بے زاری سے جواب دیا:

''آنٹی یہ سب چہرہ الاؤنس ہے۔''(ص41)

اِس بے زاری بھرے جواب میں جلن اور حسد مل جُل کر ٹپک رہا ہے۔ اِسی طرح ایک ٹی۔وی پروگرام میں میزبان نے شاہدہ حسن سے سوال کیا:

''آپ بھی اچھی بھلی شاعرہ ہیں مگر آپ کی شہرت پروین شاکر جیسی کیوں نہیں؟

شاہدہ حسن نے طنزیہ انداز میں جواب دیا:

''میں وہ سب کچھ نہیں کرتی جو پروین کرتی تھیں۔'' (ص41)

فرحت پروین ملک نے تو اس کا جواب صرف اتنا ہی لکھا ہے:

''پروین اپنی مثال آپ تھی۔ وہ مجسّم شاعری تھی۔''(ص41)

اب کوئی شاہدہ حسن سے یہ سوال بھی کرے کہ وہ بتائے کہ وہ ''سب کچھ'' کیا تھا جو پروین کرتی تھی؟ کُھل کر بتاؤ۔ صرف طنز کافی نہیں۔ مگر نہیں، وہ ''سب کچھ'' جو محترمہ کہہ رہی ہیں پروین وہ نہیں کرتی

تھی۔ اُس کی شہرت کا سبب اُس کی شاعری ہے۔ اور آپ میں اِتنا ظرف نہیں ہے کہ اس کا اعتراف کرسکیں کہ وہ ہم سے بہتر شاعرہ تھیں۔ الزام تراشی اور کیچڑ اُچھالنے سے کسی کے قد کاٹھ کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ اِس سے صرف حسد اور اندر کی جلن کا اظہار ہوتا ہے اور بس۔ وہ، وہ تو واقعی اپنی مثال آپ تھی اور آپ اُس سے کوسوں دُور ہیں۔

فرحت پروین ملک نے حسد سے لتھڑا ایک اور واقعہ بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں کراچی سے ایک شاعر صاحب ملازم تھے۔ اکثر ہمارے گھر آتے رہتے۔ جس دن ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں زیڈ۔ اے بخاری ہال میں مشاعرہ تھا، وہ ہمارے گھر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ'' آپ اپنے اِدارے کے مشاعرے میں نہیں گئے؟''

بھڑک کر بولے'' میں اُس چھٹانک بھر کی لڑکی کو مشاعرے میں جا کر سُنوں جو میرے سامنے کراچی میں بڑی ہوئی؟ کراچی ریڈیو میں آیا کرتی تھی۔''

مصنّفہ نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے۔

''جب رشک بڑھ کر حسد میں تبدیل ہو جائے تو آدمی اِسی قسم کی بات کرتا ہے۔ بہت معذرت کے ساتھ اہلِ کراچی نے اپنی شاعرہ کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا۔''(ص 56)

اہلِ کراچی سے یہ شکوہ بے جا نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا کس نے ہے؟ مصنّفہ ہی کے بقول اسلام آباد میں:

''ایک افسانہ نگار اور ایک شاعر اکثر آدھی رات کو پارو کو خوف ناک آواز میں فون کرتے تھے۔'' (ص 49)

کاش مصنّفہ نے اُن کے نام بھی لکھے ہوتے تو اُن کی خوف ناک آواز کے ساتھ اُن کے خوف ناک چہرے بھی عوام کے سامنے آجاتے۔ مصنّفہ مزید لکھتی ہیں:

''ایک غیر معروف لکھنے والے نے پروین شاکر پر مضمون لکھا (غالباً اُن کا تعلق پشاور کے علاقے سے تھا) پاکستانی معاشرے میں پروین شاکر کی شاعری اور وی۔ سی۔ آر کی وجہ سے بے حیائی میں اضافہ ہوا۔''(ص 54)

آزادی اور حقوق کے لیے قلم اُٹھانا اور گھُٹن زدہ ماحول میں عملی زندگی میں قیدِ بامشقت کاٹنے والی لڑکیوں کے احساسات اور جذبات کا اظہار کرنا ہمارے معاشرے میں جُرم ہی تو ہے، اور اِس جُرم کی سزا کے لیے معاشرے نے اس کی شاعری کو بے راہ روی، بدکرداری، بے حیائی اور بے باکی کا نام دے کر اُس کے کردار کی پاکیزگی کو داغ دار کرنے اور اُس پر کیچڑ اُچھالنے کا کوئی موقعہ ضائع نہیں کیا۔

اِس بات کو تسلیم کرنا تو بڑے حوصلے کی بات ہے کہ پروین شاکر نے بے زبان لڑکیوں کو بات کرنے کا حوصلہ دیا۔ محترمہ فرحت پروین ملک صاحبہ نے بڑے دُکھ سے لکھا ہے کہ زندگی میں ادبی بھیڑیے اُسے کھانے پر تُلے ہوئے تھے اور وفات کے بعد:

> ''جو کچھ سُنا وہ لکھا نہیں جا سکتا۔ جن لوگوں نے کبھی اس کا ڈرائنگ روم بھی نہیں دیکھا ہوگا وہ اُس کے بیڈ روم کی بات کرتے ہیں۔'' (ص 57)

اُف یہ ادبی بھیڑیے، آہ پروین شاکر، جسے مارنے کے بعد بھی سزا کا عمل جاری ہے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

فرحت پروین ملک

ایک تھی پارو

۲۴/ نومبر ۱۹۵۲ء کراچی میں سیّد شاکر مرحوم کے گھر دوسری بیٹی نے جنم لیا۔ پہلی بیٹی نسرین کے وزن پر اُس کا نام پروین رکھا گیا۔ ایک عام سے گھرانے میں وہ عام بچوں کی طرح پلی بڑھی مگر وقت کے ساتھ خاص ہوتی گئی۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی میں اپنی ذہانت کا بھرپور اظہار کیا۔

کراچی سے پروین شاکر کی ہم جماعت ہمارے گھر آئی۔ میں نے اُس سے کہا:

''پروین شاکر کمال لڑکی ہے۔'' (اُس وقت تک پروین سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی) اُس نے نہایت بے زاری سے جواب دیا: ''آنٹی یہ سب چہرہ الاؤنس ہے۔''

پی ٹی وی اسلام آباد سنٹر سے ادبی پروگرام ''رات گئے'' میں میزبان نے شاہدہ حسن سے سوال کیا: ''آپ بھی اچھی بھلی شاعرہ ہیں مگر آپ کی شہرت پروین شاکر جیسی کیوں نہیں؟''

شاہدہ حسن نے طنزیہ انداز میں جواب دیا: ''میں وہ سب کچھ نہیں کرتی جو پروین کرتی تھیں۔'' پروین اپنی مثال آپ تھی۔ وہ مجسم شاعری تھی۔

ہمارے گھر اکثر نظیر صاحب کے دوست بات کرتے کہ پروین کا تعلق کہاں سے ہے؟ کچھ اُسے بلند شہر سے منسوب کرتے، شاید اِس لیے کہ محترمہ کشور ناہید کا تعلق بھی بلند شہر سے ہے۔ میں اپنی رائے دیتی: ''میرا خیال ہے اُس کا تعلق مشرقی یو پی یا بہار سے ہوسکتا ہے۔''

ایک صاحب نے مجھ سے شرط لگائی۔ نظیر صاحب نے کہا: ''تم خط لکھ کر معلوم کرو۔'' میں نے صاف انکار کر دیا۔ ''آپ خط لکھ کر معلوم کریں وہ آپ کو ضرور جواب دے گی۔'' اپ پروفیسر صاحب نے میرا امتحان لینا شروع کر دیا۔

''تمھیں کیسے اندازہ ہوا کہ اُس کا تعلق بہار سے ہے۔''

''گیت میں زیور کا نام ہمارے علاقے کا ہے، بالی پتہ، جگنو ہار وغیرہ۔''

پروین شاکر نے نظیر صاحب کے خط کا فوراً جواب دیا اور میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ یوں نظیر صاحب اور پروین شاکر کے درمیان خط کا سلسلہ شروع ہوا۔ پروین کے انتقال کے بعد نظیر صاحب نے ان خطوط کو کتابی شکل میں محفوظ کر لیا۔

ایک دن یونیورسٹی سے نظیر صاحب کا فون آیا کہ پروین شاکر شوہر کے ساتھ دو بجے تک ہمارے گھر آئیں گی۔ اُس دن میں نے اپنی پسند کے کھانے بنائے۔ ٹھیک دو بجے پروین شاکر آ گئیں۔ نظیر صاحب ڈھائی بجے آیا کرتے تھے۔ پروین نے کچھ اس بے ساختگی سے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں جیسے وہ میری دوست یا چھوٹی بہن ہو۔ میں اُسے پارو اور وہ مجھے فرحت باجی کہنے لگی۔

میں کچن میں تھی۔ نظیر صاحب کی آمد پر دروازہ پروین نے کھولا۔ اُس نے شوخ لہجے میں شوہر کا تعارف کروایا: ''یہ ہیں میرے شوہر ڈاکٹر نصیر، آپ کے نام کے ہم قافیہ۔''

کھانا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ یہ سب کچھ میری پسند کا ہے۔ نظیر صاحب شکر خور تھے۔ اُنھوں نے جلدی سے کھانا ختم کر کے فیرنی شروع کر دی اور ہم سب سے پوچھا: ''آپ لوگ میٹھا کب شروع کریں گے؟''

''میں میٹھا زیادہ پسند نہیں کرتی، تھوڑا سا چکھ لوں گی۔''

نظیر صدیقی: ''یہ لڑکیاں کیوں میٹھا کم پسند کرتی ہیں؟''

پروین: ''اِس لیے کہ وہ ہوتی ہی Already Sweet ہیں۔''

نظیر صدیقی: ''مرد میٹھا زیادہ کیوں کھاتے ہیں؟''

پروین: ''اِس لیے کہ وہ تلخ ہوتے ہیں۔'' مسکراتے ہوئے ڈاکٹر نصیر کی طرف دیکھ کر کہا: ''آپ شوہروں کو میٹھا زیادہ کھانا چاہیے، آپ لوگ بہت کڑوے ہوتے ہیں۔''

پروین شاکر کو دِلّی کے مشاعرے میں مدعو کیا گیا تھا۔

''ہندوستان میں تمھارا قیام کب تک رہے گا؟''

نظیر صاحب کے سوال پر اُس نے کہا: ''ویزا کی مدت ختم ہوتے ہی واپس آجاؤں گی۔ میں ایک دن بھی کراچی سے دُور نہیں رہ سکتی۔''

''میں بھی کراچی میں رہنا چاہتا تھا مگر فرحت کو اسلام آباد بہت پسند ہے۔''

''بہت پُرسکون شہر ہے۔ سُنا ہے یہاں کا قبرستان بھی بہت خوب صورت ہے۔ تم بھی یہاں آجاؤ۔'' میں نے اپنی رائے دی۔

پروین شاکر بہت جذباتی ہو رہی تھی، کہنے لگی: ''قرۃ العین حیدر اور لتا منگیشکر سے مل کر بے ہوش نہ ہو جاؤں۔ قرۃ العین حیدر میری آئیڈیل ہیں۔''

''مگر تمھاری آئیڈیل نے شادی نہیں کی۔''

میرے سوال پر اُس نے بتایا: ''میں بھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آپ کو تو اندازہ ہے ہمارے یہاں اِس اقدام کو پسند نہیں کیا جاتا۔ والدین کا اصرار تھا۔''

''مگر تمھیں رشتہ دار سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ڈر ہے تمھاری سسرال والے تمھاری شاعری کو کہاں تک برداشت کریں گے۔ شاعری اور شادی کو قائم رکھنا مشکل نہ ہو جائے۔''

پروین نظیر صاحب سے مشاعرے میں غزل پڑھنے کے سلسلے میں مشورہ کرنے لگی۔ میں ڈاکٹر نصیر سے بات کرنے لگی۔ اپنے بارے میں بتایا۔ چاٹگام (مرحوم مشرقی پاکستان) میں اسکول، کالج کی تعلیم مکمل کی۔ جہاں آپ کا اسکول تھا، ہم والدین کے ساتھ وہاں رہا کرتے تھے۔

''اچھا!'' نصیر کے لہجے میں بڑی اپنائیت تھی۔

نظیر صاحب نے پروین سے پوچھا: ''کیا تم شعور میں پہلی بار انڈیا جا رہی ہو؟''

پارو نے ٹھیٹھ لہجے میں کہا: ''جی ہاں، ہوش میں پہلی بار جا رہی ہوں۔''

ڈاکٹر نصیر جو اِتنی دیر سے خاموش تھے، بول پڑے: ''نظیر بھائی! میرا خیال ہے یہ اب

بھی ہوش میں نہیں جا رہی ہیں۔“

اُن کے اِس جملے سے ہم سب بہت محظوظ ہوئے۔ پھر کہنے لگے: ”پروین ایسا کیا لکھتی ہیں جو آپ لوگ اِتنی تعریف کرتے ہیں؟ میری سمجھ میں تو اِن کی شاعری نہیں آتی۔“

”آپ جسمانی مسیحا ہیں اور آپ کی بیگم روحانی مسیحا۔“ نظیر صاحب نے ڈاکٹر نصیر کو سمجھایا۔

دورانِ گفتگو پارو نے بتایا کہ والدین اُسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔

”اچھا ہوا تم ڈاکٹر نہیں بنیں، تم تو شاعری کے لیے بنی ہو۔“

ہم نے پارو سے اپنی پسند کی غزلیں اور نظمیں ریکارڈ کیں۔

”اچھا بہت ہو گئیں کتابی باتیں، اب جیتی جاگتی تخلیق آنی چاہیے۔“

”آپ تو میری امی جیسی باتیں کرتی ہیں۔“

جب وہ جانے لگی تو میں نے بہار کی رسم کے مطابق تھوڑا سا باسمتی چاول، ہلدی کا ٹکڑا اور کچھ رقم اُس کے آنچل میں باندھ دیا۔ اُسے یہ رسم اچھی لگی۔

”آپ یہ سب اب تک کرتی ہیں!“

میں نے اُسے کہا: ”اللہ تمھیں بیٹا دے۔“

”بیٹی کیوں نہیں!“ وہ ہنس پڑی۔

پروین شاکر کا پہلا تہلکہ خیز مجموعہ کلام ”خوشبو“ نظیر صاحب نے خرید کر مجھے تحفے میں دیا۔

میں نے اُسے رومانی ناول کی طرح رات بھر جاگ کر ختم کر دیا۔ میں نے نقاد صاحب سے کہا:

”یہ شاعری کے روپ میں خوب صورت ناول ہے۔ آپ پڑھیں اور لکھیں۔“

”میرے پاس کتاب آئے گی تو دیکھا جائے گا۔“

”آپ پڑھیں تو سہی، میری خاطر ”خوشبو“ پر لکھیں۔

احمد ندیم قاسمی مرحوم اور پروین شاکر کو مضمون بہت پسند آیا (مطبوعہ ”فنون“ لاہور)

ساقی فاروقی نے کہا: ''پچیس سال کی لڑکی پر تم پچیس صفحات کا مضمون لکھتے ہو، میرے لیے تمھارے پاس وقت نہیں۔''

ساقی فاروقی نے مجھے کہا: ''میں کراچی جا رہا ہوں پروین شاکر سے ملنا چاہتا ہوں۔''

میں نے ذرا خشک لہجے میں کہا: ''آپ کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

''اُس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں جس نے یہ مصرع کہا:

لہجے میں اپنے سورۃ رحمٰن کی طرح

ساقی فاروقی کے اِس مصرعے کی تعریف سُن کر مجھے اِتنی خوشی ہوئی کہ لندن میں رہتے ہوئے اُن میں اعظم گڑھ زندہ ہے۔

ضیا جالندھری مرحوم بیگم کے ساتھ آئے اور مجھ سے پوچھا: ''یہ مضمون کیا آپ کی اجازت سے لکھا گیا ہے؟''

''اجازت کیا، میری خواہش پر لکھا گیا ہے۔''

''واقعی!'' ضیا جالندھری نے حیرت سے کہا۔

پی ٹی وی اسلام آباد سنٹر سے مشاعرہ ہونا تھا۔ ضیا جالندھری نے شاعروں کی فہرست دکھائی۔

''پروین شاکر کا نام کیوں نہیں؟'' مظہر صاحب نے ضیا جالندھری سے دریافت کیا۔

''یار وہ بہت مغرور لڑکی ہے۔ میں کراچی گیا تھا، اُس نے ملنے سے انکار کر دیا۔''

''پھر بھی تمھیں اُسے بلانا چاہیے۔''

''تم کہتے ہو تو اُس کا نام لکھ لیتا ہوں۔''

پروین شاکر نے اپنا تخلّص 'بینا' رکھا تھا۔ افسانہ نگاری پر بھی طبع آزمائی کی مگر بہت جلد تخلّص اور افسانہ نگاری ترک کر دی۔ پروین کے نام سے قدم رکھا اور خود فسانہ بن گئی۔''

جب تک یہ خوب صورت جوڑا ایبٹ آباد میں رہا ان کی ازدواجی زندگی خوش گوار تھی۔

کراچی آ کر وہ عبداللہ کالج میں پڑھانے لگی۔ سسرال والوں کا رویّہ اُس کے لیے پریشان کُن تھا۔ ماحول کو خوش گوار بنانے کے لیے کچن کا سب کام سیکھا۔ کھانا بنانے میں بھی ماہر ہوگئی۔

احمد ندیم قاسمی مرحوم کہیں لکھتے ہیں:

''میں کولمبیا گیا۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، دیگر چیزوں کے ساتھ پروین نے بہاری کباب بھی بنایا۔''

مگر اِس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کرب میں تھی۔

جب بھی گئے عذابِ درو بام تھا وہی
آخر کو کتنی دیر سے گھر جانا چاہیے

پارو نے نظیر صاحب سے دریافت کیا: ''آپ کی یونیورسٹی میں میرے لیے کوئی جگہ ہے تو میں اپلائی کروں گی۔''

ایک دن اُس کا CV بھی آ گیا۔ تقریباً معاملات طے ہو گئے تھے۔ اچانک نظیر صاحب نے اُسے یونیورسٹی کی ملازمت سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ''یہاں سب کام لکھ کر ہوتا ہے، اِس سے تمھاری تخلیقی صلاحیت متاثر ہوگی۔ اوپن یونیورسٹی میں گرمیوں کی بھی تعطیل نہیں ہوتی۔''

ڈاکٹر نصیر مرحوم اچھے انسان تھے۔ اُنھوں نے بڑی چاہت سے پروین کو جہاں ہے جیسی ہے کی بنیاد پر اپنایا تھا مگر اُن کی والدہ کے روایتی مزاج نے اُن کی زندگی کو تلخ بنا دیا۔ کبھی کبھی دو اچھے انسان بھی حالات کے ہاتھوں ایک ساتھ زندگی گزارنے میں ناکام ہو جاتے ہیں!

سی ایس ایس کے اُردو کا سوال نامہ پروفیسر ڈاکٹر صدیق شبلی صاحب نے بنایا تھا۔

''تمھاری خاطر ''خوشبو'' پر ایک سوال رکھا ہے۔''

نظیر صاحب نے سختی سے اِس راز کی حفاظت کی۔ مجھے بھی رزلٹ آنے کے بعد بتایا۔

پارو ''خوشبو'' پر سوال دیکھ کر حیران رہ گئی۔

ڈاکٹر نصیر مرحوم نے پروین کو لاہور اکیڈمی جانے سے روک دیا اور شاکر مرحوم سے

گِلہ کیا: ’’خالو پروین لاہور جارہی ہے۔‘‘

’’تم نے امتحان دینے کی اجازت کیوں دی تھی؟‘‘

نصیر مرحوم نے بڑی معصومیت سے کہا: ’’مجھے کیا معلوم تھا وہ اعلیٰ کامیابی حاصل کرے گی۔‘‘

’’تمھیں اب تک اُس کی ذہانت وصلاحیت کا اندازہ نہیں ہوا؟‘‘ پروین کے والد نے داماد سے سوال کیا۔

پارو سے پاکستان میں اگر کوئی اُن کے آبائی حوالے سے بات کرتا تو بدک جاتی مگر ہندوستان میں فخریہ انداز میں کہتی: ’’میرا تعلق بہار سے ہے۔‘‘ بیدل، شاد عظیم آبادی، علامہ جمیل مظہری کی سرزمین سے تعلق رکھنے والی شاعرہ کی کیا نفسیاتی گرہ تھی؟ اِس میں کوئی شک نہیں کہ پروین کو پاکستان سے بہت محبت تھی۔ اکثر کہتی: ’’ہمیں پاکستان کی قدر کرنی چاہیے۔‘‘ ملک سے محبت کا اظہار اِس شعر میں کیا ہے:

تہمت لگا کے ماں پہ جو دشمن سے داد لیں
ایسے سخن فروشوں کو مر جانا چاہیے

سردار جعفری اسلام آباد آئے۔ اُنھوں نے نظیر صاحب سے کہا: ’’میں پروین شاکر سے ملنا چاہتا ہوں۔‘‘

نظیر صاحب نے حیرت سے کہا: ’’آپ کو اُن سے ملنے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے۔ وہ بمبئی (بھارت) میں آپ کے گھر میں مقیم تھیں۔‘‘

سردار جعفری نے بڑی بے چارگی سے کہا: ’’وہ اور بات تھی۔ اب وہ افسر ہوگئی ہیں۔‘‘

سردار جعفری جیسی شخصیت عام شاعروں کی طرح افسروں سے الرجک تھے۔ حیرت ہے وہ ۲۲ گریڈ کی شاعرہ سے مرعوب نہیں ہوئے مگر ۱۹ گریڈ کی افسر کے رعب میں آگئے۔ پروین کی وفات پر اُنھوں نے نظم بھی کہی تھی۔ نظیر صاحب نے ’پروین شاکر ٹرسٹ‘ کے حوالے کر دی۔

ایک ذمہ دار خاتون نے بتایا کہ ایک افسانہ نگار اور ایک شاعر اکثر آدھی رات کو پارو کو

خوف ناک آواز میں فون کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پروین شاکر اپنی والدہ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی مگر اُنھوں نے اسلام آباد آنے سے انکار کر دیا۔ بیٹی کی وفات کے بعد نواسے کی خاطر اُنھیں تین سال اسلام آباد میں رہنا پڑا۔ والدہ کے انتقال کے بعد نسرین بھی اسلام آباد منتقل ہو گئیں۔ پروین شاکر کے پڑوس میں ایک کشمیری خاندان کے ساتھ رہنے لگیں۔ جنوری ۲۰۲۰ء کو نسرین کا انتقال ہو گیا۔

صدیق سالک مرحوم نے جنرل ضیاء الحق مرحوم سے پروین شاکر کے لیے C.S.S کے امتحان میں عمر کی حد میں اضافہ کروایا تھا۔ صدیق سالک کی یہ مہربانی پارو کے لیے عذابِ جاریہ بن گئی۔ سب مہربانیاں اپنے لیے ہوتی ہیں، کوئی کسی پر مہربان نہیں ہوتا۔

اسلام آباد سرگوشیوں کا شہر، یہاں لوگ اعلیٰ شخصیتوں کے بارے میں کھل کر بات نہیں کرتے۔ صدیق سالک کی حادثاتی موت پر ''جنگ'' اخبار میں پروین شاکر پر شائع ہونے والی نظم نے سرگوشیوں کا الم نشرح کر دیا۔ پروین شاکر کی خانہ بربادی میں صدیق سالک کے آسیب کا بھی اثر ہے۔ فروری ۱۹۸۴ء پارو کی شادی ختم ہو گئی اور ۲۶/ دسمبر ۱۹۹۴ء میں خود ختم ہو گئی۔

شاید ہی کسی شاعر نے زندگی میں اپنا کتبہ تحریر کیا ہو گا۔ یہ رسم بھی پروین شاکر کی ایجاد ہے۔

کتبہ

یہاں پہ وہ لڑکی سو رہی ہے
کہ جس کی آنکھوں نے نیند سے خواب مول لے کر
وصال کی عمر رت جگے میں گزار دی تھی
عجیب تھا انتظار اُس کا
کہ جس نے تقدیر کے تنگ حوصلہ مہاجن کے ہاتھ
بس اِک دریچۂ نیم باز کے سکھ پر
شہر کا شہر رہن کروا دیا تھا

لیکن وہ ایک تارہ

کہ جس کی کرنوں کے مان پر

چاند سے حریفانہ کشمکش تھی

جب اس کے ماتھے پہ کھلنے والا ہوا

تو اُس پل

سپیدۂ صبح بھی نمودار ہو چکا تھا

فراق کا لمحہ آچکا تھا!

احمد فراز نے اپنی کتاب کا نام ’’ماہِ تمام‘‘ رکھا۔ پروین شاکر نے احمد فراز سے یہ نام مانگ لیا۔

اپنے دوسرے مجموعہ کلام ’’صد برگ‘‘ کا نام پروین شاکر نے ’’ہوا برُد‘‘ رکھا تھا جسے نظیر صاحب نے رد کر دیا۔لوگ اسے دریا برُد کر دیں گے۔ہوا برُد اپنے ایک شعر سے لیا تھا (اِس وقت شعر یاد نہیں آرہا ہے)۔

پروین کے آخری مجموعہ کلام ’’انکار‘‘ میں صدیق سالک پر لکھی ہوئی نظم نہیں ہے۔سچائی کی شاعرہ کو ایسی کیا مجبوری تھی کہ اِس نظم کو کتاب میں شامل نہیں کیا؟

میری والدہ نے بتایا کہ اُن کے پڑوس میں ایک خاتون بچے کو لے کر ڈاکٹر کے یہاں جا رہی تھیں، اُنھوں نے امی کو ساتھ چلنے کو کہا۔جب وہ ڈاکٹر کے کلینک میں داخل ہوئیں تو وہاں پروین شاکر، مراد (بیٹا) کے ساتھ موجود تھی۔اُس نے امی کو سلام کیا جب کہ وہ امی کو جانتی بھی نہیں تھی۔امی نے کہا: ’’تم پروین شاکر ہو؟‘‘

’’آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟‘‘

’’تمھیں نظیر صدیقی کے یہاں دیکھا تھا۔‘‘

دورانِ گفتگو دو غنڈے قسم کے آدمی کلینک میں داخل ہوئے۔ پروین کھڑی ہوئی اور

سخت لہجے میں بولی: ''آپ یہاں بھی آ گئے! میں نے پہلے ہی فائل پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دفتر آئیں۔''

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حادثہ ایک دم نہیں ہوا۔ یہ ایک منظّم سازش تھی۔ پارو اپنی حادثاتی موت کی پیشین گوئی اِس شعر میں کر چکی تھی:

رونق بازار و محفل کم نہیں ہے آج بھی
سانحہ اِس شہر میں کوئی مگر ہونے کو ہے

پروین شاکر کی روحانی صلاحیت اور لگاؤ پر ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ نقادوں نے اِس طرف توجہ نہیں دی۔

میں کچن میں تھی۔ اچانک ڈاکٹر رخشندہ کی چیخ آئی: ''امی! پروین شاکر کا حادثے میں انتقال ہو گیا۔'' نیوز کاسٹر عشرت فاطمہ نم آنکھوں سے حادثے کی تفصیل بتا رہی تھیں۔ اُس دن موسم بھی پارو کی پسند کا تھا۔ بارش اپنے جوبن پر تھی۔

اسلام آباد کیا پورا ملک اُداس تھا۔

''امی! پروین شاکر نے مجھے اُردو کی کاپی پر آٹو گراف میں یہ شعر لکھا تھا جب میں چھٹی کلاس میں تھی۔ اب اس کو فریم کروا کر محفوظ کر لیا ہے۔

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

کچھ دیر میں سیما کا لندن سے فون آ گیا (سیما اسکالرشپ پر L.S.C میں M.S کرنے گئی تھی)۔

''امی! پروین شاکر کا یہاں انتظار ہو رہا ہے۔ وہ Ph.D کے لیے آنے والی تھیں، مگر ایک افواہ سُنی کہ اُن کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔''

''اُن کے بارے میں لوگ کچھ نہ کچھ افواہ پھیلاتے رہتے ہیں، کاش یہ خبر بھی افواہ

ہوتی!'' میں اِس سے زیادہ نہ بول سکی۔

اُن دِنوں نظیر صاحب کراچی میں ''ہمدرد فاؤنڈیشن'' سے منسلک تھے۔ مجھے اُنھیں فون کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ تین دن کے بعد نظیر صاحب کا فون آیا۔ ہم دونوں چُپ تھے۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو میری آواز بھرّا گئی۔

''اب نارمل ہو جاؤ۔'' نظیر صاحب نے مجھے حوصلہ دیا: ''یہ بتاؤ اس وقت تمھیں پروین شاکر کا کون سا شعر یاد آرہا ہے؟''

''جب سے پارو کا انتقال ہوا، میرے ذہن میں یہ شعر گونج رہا ہے:

بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کے رخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے

یہاں بھی ادبی حلقوں میں یہ شعر موضوعِ گفتگو ہے۔''

افسوس اُردو شاعری کی پارو کو کوئی دیوداس نہیں ملا۔

پروین شاکر ہمیشہ افواہوں کی زد میں رہی۔ ''جنگ'' اخبار اُس کی تصاویر اِس انداز سے شائع کرتا جیسے وہ شاعرہ نہیں بلکہ فلم اسٹار ہے۔ شکر ہے اُس نے ترنّم کا استعمال نہیں کیا ورنہ اخبار والے اُسے ترنّم ساز بنا دیتے۔ اگر وہ کسی سے ملنے سے انکار کرتی ہے تو لوگ اُسے مغرور اور بد دماغ کہتے۔ اگر کسی سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تو اُس کا اسکینڈل بنا دیا جاتا۔ دراصل لوگ اُس کی شاعری کے کردار کو خود سے منسوب کر لیتے۔ اس کی چاہت میں مبتلا ہو جاتے۔ ہمارا معاشرہ رائی کا پہاڑ، پر کا کوّا بنانے میں ماہر ہے۔ جب یہ افواہیں اُس کی سسرال والوں کے علم میں آتیں تو اُس کی زندگی میں تلخی پیدا ہو جاتی۔ سسرال کی طرف سے شاعری ترک کرنے کا حکم ملا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُسے ملازمت چھوڑ دینے کو کہا جاتا رہا۔ ضمیر جعفری مرحوم نے مجھ سے پوچھا:

''پروین شاکر کی شاعری کا Source of Inspiration کیا ہے؟''

اُن کا سوال مجھے اچھا نہیں لگا۔ احتراماً صرف اِتنا کہا: ’’میں شعر نہیں کہتی، مجھے نہیں معلوم۔‘‘

جی چاہا پوچھوں: ’’یہ سوال آپ نے کتنی شاعرات سے کیا ہے، یہ نظرِ کرم صرف پروین شاکر پر کیوں؟‘‘

پشاور سے تعلق رکھنے والی کالج کی ایک طالبہ نے مجھ سے کہا: ’’آنٹی! میرا خیال ہے اُس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔‘‘

’’تمھارا اندازہ ٹھیک ہے۔ مگر تمھیں اس کا کیسے پتہ چلا؟‘‘

’’اگر اس کا کوئی بھائی ہوتا تو وہ اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دیتا ایسی شاعری پر۔‘‘ (اُس وقت صرف ’’خوشبو‘‘ شائع ہوئی تھی)

ضیاء الحق نے خواتین کی فارن سروس میں تعیّناتی پر پابندی عائد کر دی تھی ورنہ پروین فارن سروس جوائن کر لیتی۔

ایک غیر معروف لکھنے والے نے پروین شاکر پر مضمون لکھا (غالباً اُن کا تعلق بھی پشاور کے علاقے سے تھا) کہتے ہیں: پاکستانی معاشرے میں پروین شاکر کی شاعری اور وی سی آر کی وجہ سے بے حیائی میں اضافہ ہوا ہے۔‘‘ اُن دِنوں وی سی آر کا ظہور ہوا تھا۔ معاشرے میں بے حیائی کے اضافے کا اندازہ نہیں مگر پروین شاکر کی وجہ سے لڑکیوں میں انگریزی ادب میں ایم۔اے اور سی ایس ایس کرنے کا رُجحان پیدا ہوا۔ شاعرات کی کھیپ سامنے آئی۔ لڑکیوں میں اپنی بات کہنے کا حوصلہ ہوا۔ اللہ پروین شاکر پر ہمیشہ مہربان رہا۔ سُنا تھا اُس کے خلاف ایک کتاب آ رہی ہے، مگر اُس کی حادثاتی موت پر دشمن بھی سکتے میں آ گئے اور وہ کتاب اب تک نہیں آئی۔ اُس کی موت پر ۱۸۰ اُردو کی نظمیں، تاریخِ وفات ۵ عدد، انگریزی میں ۸ نظمیں اور فارسی میں ایک نظم ’’پروین شاکر نامہ‘‘ لکھا گیا۔ شاید ہی کسی شاعر کی موت پر اِتنا کچھ لکھا گیا ہو۔ اِن نظموں کو محترمہ رفعت حیدر نے ’’سخن شہزادی‘‘ کے نام سے شائع کیا۔ جس سڑک پر حادثہ ہوا تھا اُس سڑک کو

پروین شاکر کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ یہ مشکل کام پروین قادر آغا نے انجام دیا اور پروین شاکر ٹرسٹ قائم کیا۔ رفعت حیدر کا تعلق بھی بہار سے ہے، وہ اعزازی طور پر ''پروین شاکر ٹرسٹ'' سے منسلک ہیں۔ ٹرسٹ کی طرف سے مشاعرے کے اشعار پر پینٹنگ بنوا کر ''عکسِ خوشبو'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

ناکام محبت اور ناکام شادی کے علاوہ وہ ہر جگہ کامیاب رہی۔ ''گوشۂ چشم'' کے نام سے ''جنگ'' میں کالم لکھا اور وہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ محبت تو ایک ہی ہوتی ہے، باقی سب اسی کا reflection ہوتا ہے۔ اُس کی پہلی محبت اسد اشرف ملک تھے۔ اسد اشرف ملک کے گھر سے پروین کے لیے رشتہ بھی آیا۔ مگر اُس کے والد شاکر مرحوم نے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ مسلک کا مختلف ہونا نہیں تھا بلکہ والد مرحوم کا یہ رنج تھا کہ اب پروین اپنا رِشتہ خود بھیجنے لگی! اِس ناکامی نے اُسے کامیاب شاعرہ بنا دیا:

ہارنے میں اِک انا کی بات تھی
جیت جانے میں خسارہ اور ہے

ممتاز مفتی مرحوم نے بہت مزے کی بات کہی تھی: ''مجھے اُن لڑکیوں پر ترس آتا ہے جو محبوبہ سے بیوی بن جاتی ہیں۔''

سلیم احمد نے کہا: ''نظیر! ضروری نہیں جس سے محبت ہو اُس سے شادی بھی کی جائے، تخلیق کار کو کاغذ میں جان ڈالنے کے لیے جان سے گزرنا ہوتا ہے۔''

پروین لمحہ لمحہ مرتی رہی اور کاغذ میں جان ڈالتی رہی۔ پروین شاکر کی وفات کے بعد ایک صاحب نے اُس کی زندگی پر فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔ میں نے رفعت حیدر سے کہا: ''یہ فلم نہیں بننی چاہیے۔'' فلم اعلان کی حد تک رہی۔

کسی نے ڈرامہ بنانا شروع کر دیا۔ ڈرامے کی تشکیل کے دوران سلمیٰ آغا لندن چلی گئی۔ وہ پروین شاکر کا کردار ادا کر رہی تھی۔ آج تک وہ ڈرامہ مکمل نہیں ہو سکا (اللہ کا شکر ہے)۔ یہ سب

ادبی چاہ میں نہیں کیا گیا بلکہ اُس کی شہرت اور مقبولیت کو کیش کرانا تھا کسی طور پیسہ آنا چاہیے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شخص میں بھی ایک آدھ Black spot ہوتا ہے اور بُرے سے بُرے انسان میں بھی ایک آدھ خوبی ضرور ہوتی ہے۔ پارو بھی انسان تھی۔ اُس سے بھی کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ ہمارے گھر جو بھی شاعر ادیب ہوتے وہ اُس کی شاعری پر کم، شخصیت کے عیب و ہُنر پر ضرور تبصرہ کرتے۔ ایک بار ہم نے کسی سے کہہ دیا: ''ہم لوگ اُس کے گارجین نہیں ہیں۔''

ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں کراچی سے ایک شاعر صاحب ملازم تھے، اکثر ہمارے گھر آتے رہتے۔ جس دن ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں زیڈ اے بخاری ہال میں مشاعرہ تھا، وہ ہمارے گھر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ ''آپ اپنے ادارے کے مشاعرے میں نہیں گئے؟'' بھڑک کر بولے: ''میں اُس چھٹانک بھر کی لڑکی کو مشاعرے میں جا کر سُنوں جو میرے سامنے کراچی میں بڑی ہوئی، کراچی ریڈیو میں آیا کرتی تھی۔''

جب رشک بڑھ کر حسد میں تبدیل ہو جائے تو آدمی اِسی قسم کی بات کرتا ہے۔ بہت معذرت کے ساتھ، اہلِ کراچی نے اپنی شاعرہ کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا۔

جمیل الدین عالی مرحوم نے بتایا کہ: ''پروین شاکر اکثر میری بیوی کے پاس آتی ہے، اُن سے تقاضا کرتی ہے کہ آپ عالی صاحب سے کہیں کہ وہ مجھے اپنی بیٹی بنا لیں۔'' میں نے صاف کہہ دیا: ''وہ میرے لیے شاعر ہے۔۔۔ میں اُس کو بیٹی نہیں بنا سکتا۔'' مجھے اُن کی اِس بات پر ہنسی آتی ہے، اگر اُن کی بیٹی شاعرہ ہوتی تو وہ کیا کرتے؟

پروین شاکر کی دوسری شادی بھی دو ماہ میں ختم ہوگئی۔ اُس آدمی نے پارو پر مقدمہ کر دیا۔ جمیل الدین عالی نے اُسے بیٹی تو نہیں بنایا مگر ایک مشفق باپ کی طرح اُس کا مقدمہ اپنے اثر و رسوخ سے ختم کروایا۔ یہ بات عالی مرحوم نے فون پر مجھے بتائی تھی۔ اگر احمد ندیم قاسمی نے پروین پر دستِ شفقت نہ رکھا ہوتا تو ادبی بھیڑیے اُسے کھا جاتے۔ پروین کی وفات کے بعد جو کچھ سُنا وہ لکھا نہیں جا سکتا۔ جن لوگوں نے کبھی اُس کا ڈرائنگ روم بھی نہیں دیکھا ہوگا وہ اُس کے بیڈ

روم کی بات کرتے ہیں۔زندگی کی کہانی کا سفر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

پروین شاکر کی قبر پر اُن کا یہ شعر کندہ ہے:

مر جائیں گے تو لوگ بُھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

چند سال قبل شاعرہ کے کتبہ میں اِن اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے:

یارب مِرے سکوت کو نغمہ سرائی دے
زخمِ ہُنر کو حوصلہٴ لب کشائی دے
شہرِ سخن سے روح کو آشنائی دے
آنکھیں بھی بند رکھوں تو رستہ سجھائی دے

اللہ پروین کی مغفرت کرے اور جنت میں درجات بلند کرے۔آمین۔

(فرحت پروین ملک۔۔۔یادوں کا سُندر بن)

پروین شاکر

پروفیسر ڈاکٹر مرحب قاسمی صاحبہ نے پروین شاکر کا خاکہ یا مضمون لکھتے ہوئے سب سے پہلے معاشرے میں مرد کی فوقیت کا ذکر کیا ہے اور اِس بات کا شکوہ کیا ہے کہ یہ فوقیت محض طاقت اور جنس کے سبب ہے، اعمال، افعال اور کردار کی وجہ سے نہیں۔معاشرے میں محض جنس کی بنا پر مرد کو برتر اور عورت کو کم تر سمجھا جاتا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ اِس رواج کو مذہب کا درجہ دے دیا گیا ہے۔اب مذہب کے خلاف لب کشائی کون کرے؟ اِن حالات میں اصولوں کی بنیاد پر کوئی عدل و انصاف اور عورت کے حق کی بات کرے تو کیسے کرے؟ ہر سمت خاموشی ہے اور معاشرے میں یہ قتلِ عام صدیوں سے جاری ہے۔خاموشی کی اِس فضا میں ایک ''کم تر'' کی نحیف آواز اُبھرتی ہے:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

مگر یہ نحیف آواز اِس قدر ''لاؤڈ اینڈ کلیر'' (Loud and Clear) تھی کہ اس کی بازگشت ہمہ سمت سنائی دینے لگی۔اور قارئین کے ساتھ ناقدینِ ادب کو بھی ماننا پڑا کہ آواز جان دار ہی نہیں، شان دار بھی ہے اور یہ آواز تھی پروین شاکر کی۔پروفیسر ڈاکٹر مرحب قاسمی صاحبہ نے اپنے اِس مضمون میں پروین شاکر کی شاعری کے حوالے سے ہی لکھا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ پروین شاکر کے فن اور شخصیت میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا ہے کہ پروین ایک حسّاس، ذہین، پُراعتماد، خود آگاہ اور کامیاب عورت تھی۔شائستگی، وقار اور تمکنت اُس کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے اور یہی تمام پہلو اُس کی شاعری میں انتہائی مربوط و مضبوط ملتے ہیں۔ڈاکٹر صاحبہ کے بقول:

''پروین شاکر نے اپنی شخصیت کے عین مطابق محبت کے تجربے کو ذات کی گہرائیوں

سے محسوس کیااور پھر کسی محاکمے کے خوف کی پرواکیے بغیر اُسے استعارے کے ذریعے
بیان کردیا۔‘‘

اور یوں پروین شاکر کی شعری دُنیاخوشبوؤں اور رنگوں سے بھری پڑی ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ نے پروین شاکر کی شاعری کے انھی رنگوں کو نمایاں کیاہے۔ چُنری کے دمکتے رنگ، چوڑیوں کے کھنکتے رنگ، اوس کے قطرے میں لرزتے رنگ۔

یہ رنگ واقعی بہت خوب صورت ہیں، جو نسائی لہجے اور نازک جذبوں میں گندھے ہوئے ہیں۔

اِس طرح یہ مضمون پروین شاکر کی شاعری کا تو ایک اچھا تجزیہ ہے اور اُس کی شاعری کے سارے رنگوں کی جھلک بڑی دل کش ہے، مگر اِس مضمون میں خاکے کے عناصر نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مرحب قاسمی

پروین شاکر

ذاتی طور پر میں مردانہ فوقیت (Man Dominance) کے خلاف نہیں ہوں ۔۔۔۔۔بشرطیکہ برتری کا تعیّن محض جنس پر نہیں، اعمال، افعال اور کردار پر بھی ہو۔ اگر فوقیت کا معیار طاقت اور جنس پر قائم ہو Male Dominance از خود Mal-Dominance میں بدل جاتی ہے۔ تب میرٹ کے ساتھ ساتھ انسانی و اسلامی مساوات کا قتل ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں یہ قتلِ عام صدیوں سے رائج ہے۔ مرد جنس کی بنیاد پر برتر اور عورت کم تر سمجھی جاتی ہے۔ اِس سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں رواج راسخ ہو جائے تو اُسے مذہب کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اور ''مذہب'' کے خلاف لب کشائی جسارت قرار پاتی ہے۔ چناں چہ صاحبِ فکر بھی اِس کا ذکر تک نہیں کر پاتے۔ مبادا انگشت نمائی کی اور مول رُسوائی لی۔ اندریں حالات اُصولوں کی بنیاد پر کوئی عدل و انصاف اور عورت کے حق کی بات کرے تو کیسے کرے۔ چناں چہ خامشی سی خامشی۔۔۔۔۔خامشی کی اِسی فضا میں ایک ''کم تر'' کی نحیف سی آواز اُبھری:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

''نحیف'' آواز اِس قدر ''لاؤڈ اینڈ کلیر'' تھی کہ اس کی بازگشت ہمہ سمت سنائی دینے لگی۔ بھاری بھرکم آوازیں انگشت بدنداں رہ گئیں۔ ثابت ہوا کہ جھوٹ اور کج بحثی لاجواب تو کر سکتی ہے قائل نہیں۔ قائل کرنے کی قوت صرف سچائی میں ہوتی ہے۔ ''لاؤڈ اینڈ کلیر'' آواز خصوصاً ''فنون'' لاہور کے ذریعہ اطراف واکناف میں پھیلی اور قارئین کے ساتھ ساتھ ناقدینِ ادب کو بھی ماننا پڑا

کہ آواز جان دار ہی نہیں شان دار بھی ہے۔ یہ آواز تھی پروین شاکر کی۔ پروین ۔۔۔۔۔۔، اُردو شاعری کے آسمان کا درخشندہ ستارہ۔ یہ ستارہ اگرچہ موت کے اندھیارے میں گم ہو چکا ہے لیکن اس کی ضَو اَب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ باقی ہے اور شعری ادب میں تاابد باقی رہے گی۔

پروینؔ جذبے کی شدّت اور شائستگی کی شاعرہ ہے۔ سچّا سُچّا، کھرا اور خوب صورت اِظہار اُس کی شاعری کا کرشمہ ہے۔ وہ نرم و نازک، کھری، صاف ستھیری نسائی تمثیلوں سے مزّین بے حد خوب صورت پیرایہ بیان کو شعری اسلوب دینے والی آواز ہے۔ اِس اسلوب کو ہم پروینؔ سے ہی منسوب کر سکتے ہیں۔ پروینؔ شاکر کے فنّ اور شخصیت میں کوئی تفاوت نہیں رہا۔ وہ جب تک ہمارے درمیان رہی، شائستگی، وقار اور تمکنت کی مثالی صورت رہی۔ اُس کے لہجے میں نسائیت اور غنائیت کے ساتھ ساتھ روحِ عصر کی گونج بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ پروین کے چار شعری مجموعے اُس کی ذات کا نچوڑ ہیں۔ بطور فرد پروین ایک حسّاس، ذہین، پُر اعتماد، خود آگاہ اور کامیاب عورت تھی۔ اُس کی ذات کے یہ سارے پہلو اُس کی شاعری میں انتہائی مربوط و مضبوط ملتے ہیں۔ چناں چہ اُس کا شعر اُس کی سائیکی اور ذات کا مظہر ہوتا ہے۔ تخلیق اور تخلیق کار جب ایک ہی فریکونسی، ترتیب، سمت اور رفتارر پر چلتے ہوں تو نتیجہ اثر پذیری کی صورت میں نکلتا ہے۔ اور پروین اثر پذییری کے لحاظ سے بلا شبہ ایک منفرد شاعرہ ہے۔

پروین شاکر نے اپنی شخصیت کے عین مطابق محبت کے تجربے کو ذات کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور پھر کسی محاکمے کے خوف کی پروا کیے بغیر اسے استعارے کے ذریعہ بیان کر دیا۔ مگر یوں کہ عام کو خاص بنا دیا۔ وہ خود کہتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ ”میں تخلیق کے تمام لمحوں میں صرف اپنے وجدان کے سامنے جواب دِہ رہی ہوں۔“ جب کوئی اپنے وجدان کے سامنے جواب دہی کی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو وہ نقّادوں کی پروا کرتا ہے نہ نقالوں کی۔ وہ محبت کا اِظہار لگی لپٹی رکھے بغیر کرتا ہے۔ پروین نے عشقیہ موضوعات اور ذاتی تجربات کو پوری دیانت اور متانت کے ساتھ ساتھ پوری عقیدت کے ساتھ رقم کیا۔

وصال و ہجر اب یکساں ہیں، وہ منزل ہے چاہت میں
میں آنکھیں بند کر کے تجھ کو اکثر دیکھ سکتی ہوں
مجھے تیری محبت نے عجب اِک روشنی بخشی
مَیں اِس دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں

پروینؔ شاکر کی شعری دُنیا خوشبوؤں اور رنگوں سے بھری پڑی ہے۔ چُنری کے دمکتے رنگ، چوڑیوں کے کھنکتے رنگ۔ اوس کے قطرے میں لرزتے رنگ، آنکھوں سے قوسِ قزح کے برستے رنگ۔ لہریے بنتی ہواؤں میں گُل کیاری کی خوشبو۔۔۔۔۔ بارش کے اوّلین قطروں میں ترسی مٹی کی خوشبو۔ چمن کی خوشبو، بدن کی خوشبو۔ اِدھر پھولوں کے میلے، اُدھر تاروں کے کھیت۔ لمس بدن کی روح تک اُترنے والی لذّت کا ذکر پھول، تتلی اور ہوا کے حوالوں سے ہوتا ہے:

ایسا نہ ہو کہ لمس بدن کی سزا ملے
جی پھول کا ہوا کی محبت سے بھر نہ جائے

اور

اِک حجاب تہہِ اقرار ہے مانع ورنہ
گُل کو معلوم ہے ، کیا دستِ صبا چاہتا ہے

اُس کے ہاں قدیم داستانوں اور لیجنڈز کا سحرِ تازہ نظر آتا ہے۔ جنگل، خوشبو، ہوا، سمندر، پرندہ، شجر، چاند، پھوار، آبشار اور گلاب وغیرہ۔۔۔۔ پروین کی شاعری کے خاص استعارے ہیں۔ لیکن اظہارِ جذبات کے یہ استعارے محض جذباتی سطح پر رقص نہیں کرتے بلکہ ان میں اُس کے سماجی شعور اور عصری تجربوں کی گہرائی بھی دِکھتی ہے۔ مثلاً پروین کہتی ہے:

اِس بار جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بڑا پیار تھا اُس بوڑھے شجر سے

دُلہن، حیا، چوڑی، افشاں اور رہنا یا وغیرہ وہ نسائی تمثیلیں ہیں جو ’’خوشبو‘‘ سے ’’انکار‘‘ تک

پروین کے ہاں مستعمل نظر آتی ہیں لیکن ''صد برگ'' جیسے مجموعہ کلام تک پہنچ کر پروین شعور کی پختگی کے اُس مقام پر دِکھائی دیتی ہے جہاں اجتماعی نقطۂ نظر اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی پختگی کا اعجاز ہے کہ ''صد برگ'' میں ''شبہ''، ''ظلِ الٰہی''، ''پرابلمز''، ''کنیا دان'' اور ایسی ہی کئی نظمیں قاری کو چونکا دیتی ہیں۔ ان منظومات میں شاعرہ نے معاشرتی ناہمواریوں اور انصاف کے منافی رویّوں کو براہِ راست للکارا ہے۔ للکار میں تلخی بھی ہے، احتجاج بھی۔ آمریت کے زیرِ سایہ اُگنے اور پلنے والی منفی سیاست سے لے کر عام فرد کے رویّے تک، پروین نے بھرپور احتجاج کیا ہے۔ اُس نے عورت کو بالخصوص منفرد و مختلف کر دیا جو نرم و نازک بھی ہے اور ظلم و جبر کے خلاف سینہ سپر بھی۔ پروین نے لفظ کو برتنے کے تجربات اِس ڈھنگ سے کیے کہ روایتی لفظیات بھی منفرد مفاہیم کی صورت میں منظرِ عام پر آئیں۔ اُس کے کینوس کی وسعت بھی ہم عصر شاعرات سے کہیں زیادہ ہے۔ چونکا دینے والی تراکیب پروینؔ کی شاعری کا اسلوبِ خاص ہے۔ مثلاً موسموں کے رنگ، سمندروں کی نیلاہٹ، چڑیوں کی چہکار، طلسماتی فضا، دفتروں کی زرد اُکتاہٹ، میدانِ کارزار کی جھنکار، باسیوں کا جبر، گھروں کی تنہائی وغیرہ۔ روزمرّے، محاورے اور مثل کے علاوہ اُس کے ہاں کہیں فارسی اور کہیں دھیمے سُروں میں ہندی تراکیب بھی ملتی ہیں۔ کبھی امیر خسرو کی چوکھٹ پکڑ لی تو کبھی میرؔ و غالبؔ اور فیضؔ اور فرازؔ کی مجلس میں جا بیٹھی۔ لیکن جو کہا اپنے مخصوص رنگ میں کہا۔۔۔۔۔۔ جو کہا نسائی لہجے اور نازک جذبوں میں گُندھا ہوا کہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اُردو شاعری کی تاریخ لکھی گئی۔۔۔۔ پروین شاکر کا نام نمایاں رہے گا۔ پروین کے مختلف و منفرد اسلوب کی چند مثالیں:

مجھے بارش کی چاہت نے ڈبویا — میں پختہ شہر کا کچا مکاں ہوں
شاید کہ چاند بھول پڑے راستہ کبھی — رکھتے ہیں اِس اُمید پر کچھ لوگ گھر کُھلے
کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی — اُس نے خوش بو کی طرح میری پذیرائی کی
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے — بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

(مرحب قاسمی۔۔۔ چنیدہ شنیدہ)

❁❁❁❁❁

شہزادی۔۔۔پروین شاکر

ممتاز مفتی نے پروین شاکر کا یہ خاکہ 1990ء میں لکھا۔ 1994ء میں پروین شاکر انتقال کر گئیں۔ مذکورہ کتاب ''اوکھے اَولڑے'' 1995ء میں چھپی، مگر ممتاز مفتی صاحب نے ''خاکے'' میں کوئی تبدیلی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جو لکھا تھا وہی قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خاکے پر ممتاز مفتی اسلوب پورے طور پر چھایا ہوا ہے۔ کھلم کھلی باتیں، خوب صورت جملے، جن میں رمز اُن کے نقطہ نظر اور سوچ کو مزید گہرا بھی کرتی ہے اور معنویت کو مزید واضح اور وسیع بھی۔ پروین شاکر کی شخصیت کے بارے ممتاز مفتی لکھتے ہیں

> ''پروین کی شخصیت کے تین پرت ہیں، پہلا پرت دیکھو تو لطافت ہے۔ لَے ہے، معصومیت ہے اور حیا کے جال ہی جال۔ دوسرا پرت دیکھو تو منظر ہی بدل جاتا ہے۔۔۔۔۔ذہنی پختگی، مردانہ جرأت اور Cruel Realism۔ تیسرا پرت دُکھ کی ایک بے نام بھیگ جو ساری شخصیت میں لہریں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پروین شاکر کی پُرنم شخصیت کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے دُکھ کے پانیوں میں گھرا ہوا ایک سرسبز جزیرہ ہو۔'' ص39)

تکلیف دہ، دُکھ بھرے ماضی کے باوجود اُس کے اندر امید کا دیا روشن ہے اور زندگی کرنے کا عزم موجود ہے۔ پروین شاکر کی زندگی میں اِتنے دُکھ کیوں آئے؟ ممتاز مفتی کا خیال ہے کہ:

> ''گھریلو خوشی کے متعلق قدرت کے اصول سمجھ میں نہیں آتے۔ دانش ور تو سوچ سوچ کر ہار گئے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ایسا ہوتا ہے۔ کیا ہوتا ہے۔''(ص38)

ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

> ''زندگی میں کو بجیاں گھر میں پیڑے پر بیٹھی چوڑے چھنکاتی اور سوہنیاں آہیں بھرتی

ہیں۔"(ص38)

پروین شاکرتو ممتاز مفتی کے مطابق بڑی خوش قسمت ٹھہری کہ قدرت نے اُسے خاص طور پرنوازا ہے۔ممتاز مفتی کہتے ہیں کہ پروین کی کہانی تو بہت سادہ ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"وہ بہارن ہے۔بہارنیں جسمی طور پر دھان پان ہوتی ہیں لیکن اتنی تیکھی کہ سُوئی کی طرح چُبھ جاتی ہیں۔اور پھر کٹر شیعہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔اورشیعہ خاندان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں آنکھ کھلتے ہی روایت ہوتی ہے،رِدھم ہوتا ہے،لَے ہوتی ہے،جذبہ ہوتا ہے،دُکھ ہوتا ہے،میر انیس ہوتا ہے۔پروین شاکر اِس ماحول میں پل کرجوان ہوئی۔"(ص40)

بات یہاں تک ہی نہ رہی بلکہ قدرت نے اُس میں تخلیقی صلاحیت ٹانک دی۔اور بقول مفتی صاحب:

"تخلیقی صلاحیت ہوتی تو خوب ہے لیکن المیہ اثرات کی حامل ہوتی ہے۔نارمل زندگی بسر کرنا ممکن نہیں رہتا۔۔۔۔۔۔اورقدرت نے شعراءکوسکھی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا۔۔۔۔۔۔کیونکہ جونوازے جاتے ہیں اُن پر اکلاپا مسلّط کر دیا جاتا ہے، ذاتی خوشی چھین لی جاتی ہے۔"(ص40)

اور پروین کونواز کر اُس سے ذاتی خوشیاں چھیننے کے لیے تو قدرت کوکئی پاپڑ بیلنے پڑے اورممتاز مفتی صاحب نے اپنے خاص انداز اوراسلوب سے پروین شاکر کی زندگی کے سب سے بڑے حادثے یا المیے کو قدرت کے حیلوں کے سرتھوپ کے اُسے بھی قدرت کی جانب سے ایک طرح نوازنے ہی کا حصّہ اورعمل قرار دیا ہے۔ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

"بے چاری قدرت! پروین شاکرکو سر کرنے میں اُسے کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ خانہ آبادی کی عمومیت سے بچانے کے لیے،میاں سے ان بن کا کانٹا لگا دیا گیا۔ پروین کی طبیعت میں زودحسی کی میخ لگادی،ایسی کہ نارمل ازدواجی تعلقات کی متحمل نہ رہے۔یہ سب اِس لیے کہ علیحدگی کے سوا چارہ نہ رہے۔اب اِس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ پھر سے خانہ آبادی پرمائل ہوجائے۔قدرت نے اس کے دل میں غیرعقلی اندیشے

پیدا کر دیے ہیں۔'' (ص40-41)

ممکن ہے ممتاز مفتی صاحب جو کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں ۔ قدرت ہی پروین شاکر کو بڑی شاعرہ بنانے کے لیے یہ ساری چارہ سازی کرتی رہی ہو۔ کیوں کہ بات صرف خانہ بربادی تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ بقول ممتاز مفتی:

''پھر محبوب کو پروین کے انگ انگ میں رچا کر دونوں کے درمیان سماج کی دیوار کھڑی کر دی۔'' (ص41)

اور پروین بے چاری ساری عمر اسی دیوار سے سر پٹختی رہی مگر اس دیوار کو گرا سکی نہ عبور کر سکی۔ پروین شاکر کے خاکہ نگاروں نے پروین کے اس ''محبوب'' کا تذکرہ تو دبے دبے لفظوں میں ضرور کیا ہے، مگر کسی نے بھی اس ''محبوب'' کے چہرے سے پردہ اُٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ جس سے یہ مسئلہ سلجھنے کی بجائے مزید اُلجھ گیا ہے اور مشکوک ہو کے رہ گیا ہے۔ ممتاز مفتی صاحب نے محبوب کا نام لیے بغیر اُس کے عشق کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ کہتی ہے عورت بیک وقت عاشق بھی ہے اور محبوب بھی، مرد تو صرف مضراب ہے جو چھیڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ عورت تو تاریں ہی تاریں ہیں۔ ایک بار چھڑ جائے تو پھر چھڑی ہی رہتی ہے۔''(ص42)

ممتاز مفتی صاحب کی باتوں پر تھوڑا سا غور کیا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے پروین کے لیے خانہ بربادی سے بھی زیادہ سنگین مسئلہ یہ محبوب اور اس کا عشق ہے۔ مشرقی عورت ہونے کے سبب جس کا وہ برملا اظہار تو نہیں کر سکی مگر اُس کی تاریں عمر بھر چھڑی ہی رہیں۔ پروین شاکر کے عشق کی داستان بھی عجیب ہے۔ پہلا عشق 16 برس کی عمر میں کیا جسے خاکہ نگار مجنونانہ عشق کہتے ہیں۔ اِس عشق کا کیا انجام ہوا، اِس بارے عرفانہ عزیز، خاکہ نگار اور تاریخ کے اوراق سب خاموش ہیں۔ اس کے دوسرے عشق کو حقیقی عشق کہا جاتا ہے۔ ''عاشق'' کی جانب سے باقاعدہ رشتہ طلب کیا گیا مگر والدین نے صاف انکار کر دیا اور پروین نے والدین کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا اور والدین کے کہنے پر چپ چاپ ڈاکٹر نصیر سے شادی کر لی۔ اس کی زندگی کے کچھ سال خوش گوار گزرے۔

طلاق کے بعد زندگی دُکھ اور کرب سے بھری پڑی ہے۔ اب خدا جانے اس کی زندگی کی تاریں جو عمر بھر چھڑی رہیں، اس کا سبب پہلے عشق ہیں یا طلاق اور اُس کے بعد کی زندگی۔

ممتاز مفتی نے اس نازک اندام، دھان پان ''شہزادی'' کی شاعری کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں پروین نے اپنے کلام میں نسائی جذبات پر بھی بات کی ہے مگر کھل کر نہیں، یہاں وہاں کہیں کہیں اشارات میں اور پھر ان نسائی جذبات اور شاعری کے بارے اشفاق احمد ورک کے خاکے ''خوش بو والی شاعرہ'' کا حوالہ بھی دیا ہے اور لکھا ہے:

''ورک لکھتا ہے:

> ''اِس دُنیا میں غزل کی وجہِ آغاز عورت اور عورت کی وجہِ آغاز مرد ہے اور اب یہ تینوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو چکے ہیں۔ اُردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مردوں کے ساتھ خواتین شاعرات کی بھی کمی نہیں مگر ان میں اکثر کے ہاں شاعری بولتی ہے تو عورت غائب ہو جاتی ہے، اور عورت کی آواز سنائی دیتی ہے تو شاعرہ پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ پروین شاکر پہلی خاتون شاعرہ ہے جس کے ہاں عورت اور شاعرہ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔'' (ص42)

اور یہی اُس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ثابت ہوا۔ اُس نے عورت اور شاعرہ کو قدم سے قدم ملا کر چلانے کی کوشش تو کی مگر مردوں کے اِس معاشرے میں عورت تو راستے ہی میں کہیں لڑکھڑا کر گری اور دم توڑ گئی اور شاعرہ آج بھی کامیابی اور کامرانی کی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔

ممتاز مفتی نے بھی پروین شاکر کو ایک مرد ہی کی آنکھ سے دیکھا ہے اور پروین شاکر کے دُکھوں کا ذکر تو کیا ہے مگر اُسے بھی اپنے مخصوص انداز میں قدرت کی نوازش قرار دیتے ہوئے اُس کی ''خوش قسمتی'' ٹھہرایا ہے۔ اب خدا جانے اس طرح مفتی صاحب نے اُس کے دُکھوں کی شدت کو کم کرنے اور دلاسہ دینے کی کوشش کی ہے یا مرد کی ''بے حسی'' کا مظاہرہ کیا ہے۔ خاوند سے ''علیحدگی'' خواہ اس کا سبب کچھ بھی ہو عورت کے لیے بہت اذیت ناک ہوتی ہے

اورمرد اس عورت کا کتنا بھی خیر خواہ یا ہمدرد ہو، اُس ’’اذیت‘‘ کو محسوس اور عورت کی ذہنی حالت کا ادراک کر ہی نہیں سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اُسے قدرت کے نوازنے کا حیلہ قرار دے کر جھوٹی تسلی دے سکتا ہے اور یہی ممتاز مفتی نے اِس خاکے میں کیا ہے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

ممتاز مفتی

”شہزادی“۔۔۔پروین شاکر

ناقد کہتے ہیں باہر کی بات کرو بھیتر کی مت کرو۔صرف خاکہ لکھو۔ہم نے خاکہ نویسی کے اصول جو متعیّن کر دیے ہیں،صرف آؤٹ لائن۔اب اگر میں پروین کی آؤٹ لائن کی بات کروں تو وہاں تو آؤٹ لائن ہی آؤٹ لائن ہے۔ایسی آؤٹ لائن کہ جس کے چکر میں پڑ جاؤ تو باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے۔ملے بھی تو باہر نکلنے کو جی نہ چاہے۔

اِس آؤٹ لائن کے چکر میں صرف میں،آپ،ہم ہی نہیں پھنسے ہوئے،خود پروین شاکر بھی پھنسی ہوئی ہے۔باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔عجیب کش مکش میں گرفتار ہے۔اس سے پناہ بھی چاہتی ہے،اس کا لشکارہ مارے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔

اللہ نہ کرے کسی خاتون کی آؤٹ لائن جاذبِ نظر ہو۔ہو تو وہ نظروں پر چڑھ جاتی ہے۔اُس کی زندگی اپنی نہیں رہتی۔لاکھ پھونک پھونک کر قدم رکھے۔خود کو احتیاط کی زنجیروں میں جکڑ لے،امان نہیں ملتی۔

اور پروین کی بدقسمتی تو دو آتشہ ہے۔آؤٹ لائن کے ساتھ اِن لائن بھی ہے۔معمولی نہیں،بڑی گمبھیر اِن لائن ہے۔

میرا مصوّر دوست آذر ذوبی کہتا ہے کہ مفتی لفظ کوئی چیز نہیں،زندگی تو لکیروں سے عبارت ہے۔

کچھ باہر کی،کچھ اندر کی،کچھ اوپر کی۔

یعنی کچھ خدوخال کی، کچھ ذہنی رجحانات کی، کچھ تقدیر کی۔

عام طور سے افراد کی زندگی میں اِن تینوں میں سے کوئی ایک لکیر حاوی ہوتی ہے۔

پروین میں تینوں حاوی ہیں۔

باہر سے دیکھو تو وہ نازک اندام، دھان پان لڑکی نظر آتی ہے۔قریب جاؤ تو منظر یکسر بدل جاتا ہے۔آپ کے روبرو ایک بالغ العقل، ہوش مند، زیرک، منفرد خیالات اور مضبوط کردار کی خاتون بیٹھی ہوگی۔

وہ سہارے سے بے نیاز ہے۔ ہر بات میں منفرد رائے رکھتی ہے۔مگر سہارا مل جائے تو کفرانِ نعمت نہیں کرتی۔

تکلیف دِہ دُکھ بھرے ماضی کے باوجود اس کے اندر اُمید کا دِیا روشن ہے، زندگی کرنے کا عزم موجود ہے۔

پروین کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بیٹے مراد کے لیے جیتی ہے۔

سچ کہتی ہے، لیکن کبھی کبھی اس کے انداز کو دیکھ کر شک پڑتا ہے کہ اس میں خود اکیلے جینے کی شکتی بھی موجود ہے۔

گھریلو خوشی کے متعلق قدرت کا اصول سمجھ میں نہیں آتا۔ دانش ور سوچ سوچ کر ہار گئے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اِٹ اِز ناٹ اِن دی فِٹنیس آف تھنگز (It is not in the fitness of things)۔لیکن ایسا ہوتا ہے کہ زندگی میں ''کوجھیاں'' گھر میں پیڑے پر چُوڑے چھنکاتی ہیں اور سوہنیاں ہو کے بھرتی ہیں۔

گھر کوجھیاں دے پکن پرونٹھے

تے سوہنیاں دی اگ نہ بلے

حکماء کہتے ہیں ٹھیک تو ہے، سارا کھیل تو آگ کا ہے، حسن تو مفت میں بدنام ہے۔ بے شک حُسن میں مرد کو کھینچ لانے کی شکتی موجود ہے، لیکن اپنا بنائے رکھنے کی قوت موجود نہیں۔

نطشے کہتا ہے:

Verily man loveth danger and play so loveth he woman. The most dangerous of all the playthings.

پروین کی شخصیت کے تین پرت ہیں:

پہلا پرت دیکھو تو لطافت ہے، لَے ہے، معصومیت ہے اور حیا کے جال ہی جال۔

دوسرا پرت دیکھو تو منظر ہی بدل جاتا ہے۔ لولی وینس ڈی مائیلو بن کر بیٹھ جاتی ہے۔ ذہنی پختگی، مردانہ جرأت اور Cruel Realism۔

جبھی سیانے سمجھدار پہلے پرت پر ہی گزارہ کر لیتے ہیں۔ ذاتی تحفّظ یا ڈر کے مارے فاصلے قائم رکھتے ہیں۔

تیسرا پرت پیش منظر نہیں پس منظر ہے۔ دُکھ کی ایک بے نام بھیگ جو ساری شخصیت میں لہریں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

پروین شاکر کی پُرنم شخصیت کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے دُکھ کے پانیوں میں گھرا ہوا ایک سرسبز جزیرہ ہو۔ لیکن اُس کی آنکھ میں ایک ایسی نگاہ بھی ہے جو چلتی آندھی کو باندھ سکتی ہے، دریا کا رُخ موڑ سکتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اُس کی پُرنم شخصیت، جاذب کیفیت کے علاوہ ایک ہتھیار بھی ہو۔

پھول پر شبنم کے قطرے دیکھ کر کبھی کبھی شک پڑتا ہے کہ دُکھ ایک سنگار بھی ہے، ایک انوکھا مگر زُود اثر کاسمیٹک (Cosmetic)۔

پروین کی کہانی بہت سادہ ہے۔

وہ بہارن ہے۔ بہارنیں جسمی طور پر دھان پان ہوتی ہیں لیکن اِتنی تیکھی کہ سُوئی کی طرح چُبھ جاتی ہیں۔

کٹر شیعہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ کٹر شیعہ خاندان کی ایک خصوصیت کہ ہے کہ وہاں

آنکھ کھلتے ہی روایت ہوتی ہے، کلام ہوتا ہے، رِدھم ہوتا ہے، لَے ہوتی ہے، جذبہ ہوتا ہے، دُکھ ہوتا ہے، میر اَنیس ہوتا ہے۔

پروین اس ماحول میں پل کر جوان ہوئی۔

پھر قدرت نے اُس میں تخلیقی کلی ٹانک دی۔تخلیقی صلاحیت ہوتی تو خوب ہے لیکن المیہ اثرات کی حامل ہوتی ہے۔نارمل زندگی بسر کرناممکن نہیں رہتا۔

دانش ور اِس سامنے دھری حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ وہ کیفیت جسے ''ہیپی نس''(Happiness) کہا جاتا ہے، صرف میڈیا کونصیب ہے۔

لگتا ہے کہ قدرت نے شعراء کو سکھی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا۔وہ جو زندگی کی انڈر بیٹ (Underbeat) کو سُننے کی حس سے نوازے جاتے ہیں اُنھیں ذاتی زندگی بسر کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

بانسری میں چھید اِس لیے ڈالے جاتے ہیں کہ سُر پیدا ہو۔

پروین شاکر کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ نوازی گئی ہے۔

جو نوازے جاتے ہیں اُن پر اکلاپا مسلّط کر دیا جاتا ہے۔ذاتی خوشی چھین لی جاتی ہے۔

دُکھ درد کی ایسی سرتیاں سمرتیاں لگا دی جاتی ہیں کہ وہ ہر لحظہ جھن جھن کرتی ہیں۔

بے چاری قدرت!

پروین شاکر کو سر کرنے میں اسے کیا کیا جتن کرنے پڑے خانہ آبادی کی عمومیت سے بچانے کے لیے۔میاں کے ساتھ ان بن کا کانٹا لگا دیا۔پروین کی طبیعت میں زُود حِسی کی پخ لگا دی، ایسی کہ نارمل ازدواجی تعلقات کی متحمل نہ رہے۔یہ سب اِس لیے کہ علیحدگی کے سوا چارہ نہ رہے۔

پھر محبوب کو پروین کے انگ انگ میں رچا کر دونوں کے درمیان سماج کی دیوار کھڑی کر دی۔

اور اب ۔۔۔۔۔۔۔ اب جب کہ وہ سماجی آزادی، ذہنی پختگی، کرداری استحکام کی

سر تیوں سمرتیوں سے آراستہ ہے اور اِس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ پھر سے خانہ آبادی پر مائل ہو جائے، قدرت نے اُس کے دل میں غیر عقلی اندیشے پیدا کر دیے ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے۔

قدرت نے اُس کے ذہن کو اِس حد تک مسخّر کر رکھا ہے کہ وہ اپنی تازہ تصنیف کا نام ''انکار'' رکھنے پر مجبور ہے۔

صاحبو! ہمیں شعراء نے کنفیوز کر رکھا ہے۔

آج تک ہم پر یہ بھید نہیں کھلا کہ عاشق کون ہے، محبوب کون ہے؟

شاعر کہتے ہیں، عاشق ہم مرد لوگ ہیں۔ عشق کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ نازک اندام خواتین عشق کے کٹھن مطالبات سے عُہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔

خواتین کہتی ہیں، مردوں کی بات نہ سُنو۔ انھیں بڑ مارنے کی پرانی عادت ہے۔ انھوں نے زبردستی غنڈہ بازی کے زور پر عشق کے رول پر قبضہ کر رکھا ہے۔ عشق ایک کیفیت ہے جسے سر کرنے سے نہیں بلکہ سہنے سے تعلق ہے۔ مجنوں بن کر دشت پیمائی کرنا یا رانجھا بن کر مجھیاں چرانا عشق نہیں ہوتا۔ عشق کرنا تو صرف عورت جانتی ہے۔

نفسیات کے ماہر کہتے ہیں کہ مرد تو ہارمونیم کی مصداق ہوتا ہے۔ اُنگلی رکھ دو تو سُر بجتی ہے، اُٹھالو تو ختم ہو جاتی ہے اور عشق تو ایک تسلسل ہے۔ مسلسل جذبہ، آتا جاتا نہیں۔ قائم۔

اس کے برعکس عورت تو تاریں ہی تاریں ہیں۔ ایک بار چھڑ جائے تو پھر چھڑی ہی رہتی ہے۔

مجھے شاعرات سے شکایت ہے کہ اُنھوں نے اپنی تخلیقات میں صرف انسانی جذبات کا ذکر کیا ہے، نسائی جذبات کا نہیں۔

پروین نے اپنے کلام میں نسائی جذبات پر بات کی ہے۔ کھل کر نہیں، یہاں وہاں، کہیں کہیں اشارت میں۔

کہتی ہے عورت بیک وقت عاشق بھی ہے اور محبوب بھی۔مرد تو صرف مضراب ہے جو چھیڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔

اشفاق احمد وِرک نے جو پائے کا مزاح نگار ہے،''خوشبو والی شاعرہ'' کے عنوان سے پروین شاکر کا خوب صورت خاکہ لکھا ہے۔

نسائی جذبات اور شاعرات کے متعلق وِرک لکھتا ہے:

''اِس دُنیا میں غزل کی وجہِ آغاز عورت اور عورت کی وجہِ آغاز مرد ہے اور اب یہ تینوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو چکے ہیں۔اُردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مردوں کے ساتھ خواتین شاعرات کی بھی کمی نہیں مگر ان میں اکثر کے ہاں شاعری بولتی ہے تو عورت غائب ہو جاتی ہے،اور عورت کی آواز سُنائی دیتی ہے تو شاعرہ پس منظر میں چلی جاتی ہے۔پروین شاکر پہلی خاتون شاعرہ ہے جس کے ہاں عورت اور شاعرہ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔''

پروین شاکر کے کلام کے متعلق وِرک لکھتا ہے:

''پروین شاکر کو زبان پر پوری گرفت ہے۔اُردو زبان پر اور اپنی زبان پر بھی۔یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور اِشارات اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں۔جو چاہتی ہے لکھ دیتی ہے۔لوگ بھی وہی چاہتے ہیں جو لکھ دیتی ہے۔

اتنی سی عمر میں اس نے اِتنے کام کر لیے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ آگے چل کر کیا کرے گی،جبکہ میرے فلسفی دوست مسٹر اُلّو کا کہنا ہے کہ ایسے کام صرف اِسی عمر میں ہو سکتے تھے۔''

(ممتاز مفتی۔۔۔۔اوکھے اَولڑے)

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

پروین شاکر۔۔۔خوشبو کی ہجرت

طاہر مسعود صاحب نے خاکے کے آغاز ہی میں اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ پروین شاکر سے اُن کی کبھی نہ دوستی رہی اور نہ ایسے مراسم ہی رہے کہ اُنھیں قریب سے دیکھا ہو اور اُن کی عادات واطوار کا بہ غور مشاہدہ کیا ہو۔ (ص 106)

طاہر مسعود صاحب کی پروین شاکر سے صرف دو تین ملاقاتیں ہوئیں مگر اِدھر اُدھر سے اُنھوں نے اس کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا اور پھر اُس کی حادثاتی موت، جس پر دوست دشمن سبھی بھونچکا رہ گئے، اُنھیں شاید اسی حادثے نے خاکہ لکھنے کی تحریک بخشی۔ اور پھر اُنھوں نے سُنی سُنائی باتوں اور اپنی ملاقاتوں کی بنیاد پر زورِ قلم صرف کیا اور اُردو ادب میں ایک نئے خاکے کا اِضافہ ہو گیا۔

پروین شاکر سے پہلی ملاقات سے پہلے طاہر مسعود صاحب یونیورسٹی میں اپنے زمانۂ طالب علمی کو یاد کرتے اور اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ اُن کے زمانۂ طالب علمی سے پہلے پروین شاکر یونیورسٹی میں اپنی خوشبو ’’کھلا‘‘ کر اور اپنی شاعری کے نقوش چھوڑ کر جا چکی تھیں اور ادب میں اپنا مقام بنانے کے لیے سنجیدگی سے کوشاں تھیں۔ اور یونیورسٹی میں طاہر مسعود اور اُن کا حلقۂ احباب اُن کی شاعری پر بحثیں کیا کرتا تھا۔ طاہر مسعود صاحب کے اپنے بقول:

> ’’ہم لوگوں کی ادبی بیٹھکوں میں اُن کا ذکر کبھی عمدگی سے نہ ہوا۔ جب بھی ہوا اُن کی شاعری کی نفی اور اُن کی شاعرانہ صلاحیت کے انکار سے ہوا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ اِس نفی و انکار کے پیچھے رشک و حسد کا خفیف سا جذبہ چھپا ہے۔۔۔۔۔۔ قاسمی صاحب کی حوصلہ افزائی بھی بہت سوں کی ناخوشی کا سبب تھی۔‘‘ (ص 107)

مصنّف نے ’’رشک‘‘ کا ذکر تو شاید محاورتاً کر دیا ہے، حسد کا جذبہ ہی زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ وگرنہ قاسمی صاحب کی حوصلہ افزائی پر ناخوشی کا جواز کیا بنتا ہے؟ اِس گروپ کے نزدیک وہ

ایک روایتی سی شاعرہ ہے جومتوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کے رومانی جذبات کی ترجمان ہیں اور بس۔ اِس گروپ کے سرخیل قمر جمیل صاحب بھی جدیدیت کی رَو میں پروین شاکر کی شاعری بابت کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے تھے تو پھر بقول مصنّف:

> ''جب ادب کے ''گاڈ فادر'' ہی سے سند نہ ملی ہو تو پروین شاکر گاڈ فادر کی اُمت یا اُن کے حواریوں میں کیسے پسندیدہ اور اہم ٹھہرتیں؟'' (ص 107)

اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصنّف طاہر مسعود جیسے لوگ، جنھوں نے پروین کے کلام کو پڑھا تک نہیں تھا، شاعری کو شدّ ومدّ سے مسترد کرنے کی صدائیں سُن کر متاثر ہو چکے تھے۔ ذہن میں یہی تاثر موجود تھا کہ مصنّف کی ریڈیو پاکستان کراچی میں ''بزمِ طلباء'' کے مشاعرے میں پروین شاکر سے پہلی ملاقات ہوتی ہے۔ یہاں مصنّف نے اُس کی شاعری پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، البتہ یہ ضرور لکھا ہے کہ پستہ قامتی کے باوجود اُسے خوب صورت کہا جا سکتا ہے اور:

> ''تب تک اُن کے اندر ایک سادگی اور متوسط گھرانے کی لڑکیوں کا رکھ رکھاؤ اور تمیز و تہذیب موجود تھی۔'' (ص 107)

اور مصنّف اپنی اِس نیکی پر ''شاداں وفرحاں'' نظر آئے کہ گھر جانے کے لیے رکشہ پکڑنے میں اُس کی مدد کی تھی۔

مصنّف کے نزدیک ''خوشبو'' کا منظرِ عام پر آنا شہر کراچی کی ادبی زندگی کا ایک قابلِ ذکر واقعہ تھا۔ اور محمود دکنور صاحب جو اِس ''ادبی گروپ'' کے ایک ممبر تھے، اُنھوں نے ایک دن مصنّف سے کہا:

> ''یار ''خوشبو'' میں تو پروین شاکر نے بڑے شاعرانہ جوہر دِکھائے ہیں۔ یہ جو لوگ اُس کی شاعری کو سنجیدگی سے لینے کو تیار نہیں ہیں، یہ پروین شاکر جیسا ایک مصرع تو کہہ کر دکھائیں۔'' (ص 108)

اپنے ادبی مربی محمود دکنور کی پروین شاکر کی شاعری پر تعریف وتوصیف کے کلمات سُن کر مصنّف بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ:

''پروین شاکر کی شاعری سے بے التفاتی جدیدیت زدہ حلقوں میں یقیناً غیر ادبی وجوہ کی بنا پر ہے۔ ورنہ اُن کی شاعری کی بابت یہ رائے پروین شاکر نے اُردو شاعری کو نسائی لمس سے آشنا کیا ہے، بڑی حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔'' (ص108)

مصنّف کو اپنے ادبی مربی کی باتیں سُن کر بھی پروین شاکر کی شاعری میں عطاء الحق قاسمی کی طرح صرف ''نسائی لمس'' ہی دِکھائی دیا ہے۔ شاید مرد کی آنکھ اس سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتی یا وہ دانستہ طور پر اپنے آپ کو یہاں تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں بہر حال ایک لذّت کا پہلو تو موجود ہے۔

''خوشبو'' کی تقریبِ رونمائی آرٹس کونسل کراچی میں ہوئی اور بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس جلسے میں سجاد میر جیسے لوگ بولے اور خوب بولے۔ مصنّف کے بقول:

''پروین شاکر کی مقبولیت کے ادبی طیارے نے یہیں سے ٹیک آف کیا اور اُونچے آسمانوں کی طرف اُڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ کراچی کے ادیبوں، شاعروں کی رسائی سے بھی باہر ہو گئیں۔'' (ص108)

کراچی کے ادیب شاعر، خاص طور پر نثری نظم سے متاثر نوجوان شاعر جنھوں نے ''خوشبو'' کو ''ہُنھ یہ رومانی شاعری'' کہہ کر جھٹک دیا تھا اُنھیں بھی اِس بات کی شکایت ہی رہی کہ پروین شاکر نے اِتنی اُونچی اُڑان کیوں بھری ہے؟ اُن کی رسائی سے باہر کیوں اور کیسے ہوگئیں؟ کڑوی کسیلی سُننے کے لیے اُن کے حلقے تک ہی محدود کیوں نہیں رہی؟ اِسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ شاعروں کا ظرف ہمیشہ چھوٹا ہوتا ہے اور وہ ''مارکھنڈے'' ہوتے ہیں۔ ان میں ''حسد'' کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ کسی کو آگے بڑھتے اور شہرت حاصل کرتے ہوئے دیکھ کر اپنے اسی ''حسد'' کے سبب جل ہی اُٹھتے ہیں اور موقع ملنے پر ''سینگ'' مارنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ پروین شاکر اُن کے حلقے سے آزاد اور اُن کی رسائی سے باہر ہو کر شہرت کی منزلوں کو چُھو رہی تھی۔ نہ صرف اندرونِ ملک، بلکہ باہر بھی اُس کی زبردست پذیرائی ہو رہی تھی۔ اور مصنّف کے مطابق:

''پروین شاکر نے ادبی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے لیے بھارت کا سفر اختیار

کیا۔ جہاں اُن کا سواگت قرۃ العین حیدر نے یہ کہہ کر کیا کہ: ''ارے لڑکی! اتنی چھوٹی سی ہو کر تُو نے اِتنا سارا ''اچھا'' کلام کیسے کہہ دیا؟'' (ص108)

قرۃ العین حیدر نے پروین شاکر کے حُسن کی نہیں بلکہ اُس کے ''اچھے'' کام کی تعریف کی تھی۔ بھارت سے واپس آ کر پروین شاکر رسالہ ''عقاب'' جسے اُس وقت طاہر مسعود صاحب بھی جوائن کر چکے تھے، میں اپنی پذیرائی کی داستان ''امن کے سترہ دن'' کے عنوان سے قسط وار لکھنے لگی۔ مصنّف اس سفرنامے کو بہت دل چسپی سے پڑھا کرتے تھے، کیونکہ اُس میں بقول مصنّف کے:

''میری محبوب مصنفہ عینی کا تذکرہ خاصا تھا۔'' (ص109)

مگر مطالعے کے دوران مصنّف کو جو چیز کھٹکتی وہ پروین کی نرگسیت اور خود پسندی تھی۔ اپنی اہمیت کا جا بجا احساس تھا۔ مصنّف کو گلہ تھا کہ:

''عینی آپا کے جذبہء دلداری و انکسار و محبت کو اُن کی خود پسندی اور نرگسیت نے کچھ اور ہی معنی پہنا دیے۔'' (ص109)

مصنّف اُس وقت تک بڑی کوفت اور اذیت میں رہے جب تک انتظار حسین صاحب بھارت جا کر عینی آپا سے نہیں ملے اور واپس آ کر یہ نہیں لکھا کہ عینی کہتی ہیں:

''پچھلے دِنوں پاکستان سے ایک ''چھوکری'' پروین شاکر آئی تھی۔ اُس سے میں اچھے سے ملی۔ اُس نے واپس جا کر جانے کیا کیا اُلٹی سیدھی باتیں میرے بارے میں لکھ دیں۔'' (ص109)

مصنّف کے مطابق عینی آپا کو غصّہ ''عقاب'' میں چھپے سفرنامہ میں موجود اُلٹی سیدھی باتوں پر ہی نہ تھا بلکہ اِس بات پر بھی تھا کہ:

''پروین نے اُن پر آ کر ایک نظم بھی لکھ ماری تھی۔ نظم میں عینی کا تاثر ایک تنہائی اور اُداسی میں گھلتی ہوئی عورت کا اُبھرتا تھا۔'' (ص109)

مصنّف کا بیان اور انداز اُن کے اندر کی کوفت اور اذیت کا کھلم کھلا اظہار اور اُن کے ذہن کی کسی خلش کی چغلی کھاتا ہے۔

عینی سے پروین شاکر کی ملاقات اور اس ملاقات بارے اُس کے تاثرات کو رفاقت جاوید نے بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

''پروین شاکر جیسی حساس لڑکی نے قرۃ العین حیدر جیسی جہاں دیدہ عورت کی تنہائی، کرب اور پھر چڑچڑے پن کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''عورت کو ہر صورت اور ہر حال میں ایک بار شادی ضرور کرنا چاہیے۔''(2)

اور قرۃ العین حیدر کے لیے لکھی نظم میں بھی ایسی کیفیت کا تذکرہ ہے۔

''جیون زہر کو متھ کر امرت نکالنے والی موہنی
بھرا پیالہ ہاتھوں میں لیے پیاسی بیٹھی ہے
وقت کا راہو گھونٹ پہ گھونٹ بھرے جاتا ہے
''دیوی'' بے بس دیکھ رہی ہے
پیاس سے بے کل ہے اور چپ ہے۔''

(نظم ''قرۃ العین حیدر'' سے اقتباس۔ ''صد برگ'')

(مزید تفصیل محترمہ رفاقت جاوید کی مذکورہ کتاب اور پروین شاکر کی ''صد برگ'' میں دیکھی جا سکتی ہے)

محترم طاہر مسعود صاحب کو پروین شاکر کی نرگسیت اور خود پسندی تو بہت کھٹکتی ہے مگر اپنی محبوب مصنّفہ ''عینی'' کی تنہائی اور اُداسی اور ''اندازِ تفاخر'' دِکھائی نہیں دیتا۔ بہر حال یہ اپنا اپنا حُسنِ نظر اور اندازِ نظر ہے۔ ہماری تو بس یہی دُعا ہے کہ اللہ ہر ایک کو کوفت اور اذیت سے محفوظ رکھے۔

مصنّف نے ایک ''ادبی عدالت'' کی رُوداد بھی لکھی ہے، جو یونیورسٹی میں طلباء یونین کے لیے لگائی گئی۔ استغاثہ کے وکلا حسین حقانی اور مصنّف یعنی طاہر مسعود صاحب منتخب ہوئے اور گوشمالی کے لیے ابن صفی اور پروین شاکر کو بلایا گیا۔

مصنّف نے سب سے پہلے تو پروین شاکر کے لباس پر اپنے تحفّظات کا یوں اظہار کیا:

''پروین شاکر پنڈال میں داخل ہوئیں تو ایک لمحے کے لیے تو میں اُنھیں پہچان نہ سکا۔ گہرے میک اپ اور زرق برق ساڑھی میں ملبوس، جب سج سج چلتی اسٹیج کی سیڑھیاں اُنھوں نے عبور کیں تو میں سر کو دوپٹے سے چھپائے سادہ سے کپڑوں میں

اُس پروین کو ڈھونڈتا اور یاد کرتا رہ گیا جسے میں نے بندر روڈ کی پُر ہجوم سڑک پر ایک پرانے سے سال خوردہ رکشے پر سوار کرایا تھا۔ وقت کیا سے کیا کر دیتا ہے آدمی کو۔‘‘(ص110)

مصنف کے ان تحفّظات سے اختلاف کرنے کی قطعاً بھی گنجائش نہیں ہے۔ سر ڈھانپے، سادہ کپڑوں میں ملبوس اور سال خوردہ رکشے پر سوار ہونے والی پروین کو ڈھونڈنے اور اِس نئے گیٹ اپ میں موجود پروین شاکر کو پہچاننے میں جس دِقت کا سامنا اور جس صدمے سے دو چار ہونا پڑا، اُس کا ہر ذی شعور کو احساس ہوسکتا ہے۔ وقت آدمی کو کیا سے کیا کر دیتا ہے؟ اِس سوال کا حل ڈھونڈنا اور اِس مسئلے کا حل وقت کا اہم تقاضا ہے۔ اور خاص طور پر خواتین جو کیا سے کیا ہو جاتی ہیں، اس پر تو لازمًا قدغن ہونی چاہیے۔ خواتین کو اندازہ اور احساس تک نہیں کہ اس ’’کیا سے کیا‘‘ ہونے پر مرد حضرات پر کیا گزرتی ہے؟ اور اُنھیں پہچاننے، ڈھونڈنے اور یاد کرنے کے کِن مشکل اور دُشوار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مردوں کے اِس معاشرے میں ’’کیا سے کیا‘‘ کی اجازت صرف مردوں کو ہونا چاہیے۔ بہرحال پروین شاکر کی ظاہری ہیئت کو دیکھ کر اور اس ذہنی صدمے سے دو چار ہونے کے بعد وکیل استغاثہ طاہر مسعود صاحب نے پروین شاکر پر جرح شروع کی تو وہ تلخی کا شکار ہوگئیں اور مصنّف کے بقول:

’’وہ تلخ ہونے میں حق بجانب تھیں کہ میری جرح کا ایک سوال ہی احمقانہ تھا۔‘‘(ص111)

اگر کوئی اپنی حماقت کا خود ہی اعتراف کرے تو اس پر کسی قسم کے تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہم تو صرف یہ عرض کریں گے کہ وکیل استغاثہ یعنی مصنّف انتہائی سیدھے سادے اور بھولے انسان ہیں جو دوستوں کی مشاورت سے سوال مرتّب کرتے ہیں اور پھر سوال کی حقیقت پر غور کیے بغیر ہی پوچھتے ہیں کہ:

’’اُنھوں نے اپنے شعری مجموعے کا نام ’’خوشبو‘‘ کیوں رکھا، ’’بدبو‘‘ کیوں نہ رکھا؟‘‘

اور پھر گِلہ کرتے ہیں کہ پروین تو تلملا اُٹھیں اور کوئی سخت سا جواب دیا۔ اب یہ بھی

کمال ہے کہ اپنا سوال یاد ہے مگر اس کا جواب یادنہیں ۔اخلاق کا تقاضا تھا کہ وہ جواب بھی لکھا جاتا۔ اِس سوال جواب کو یہیں چھوڑ کر مصنّف اگلا سوال داغتے ہیں ۔

مصنّف کا اگلا سوال پروین شاکر کی نظم ''ضد'' کے حوالے سے ہے ۔مصنّف نے یہ نظم اس خاکے میں درج نہیں ، صرف سوال ہی کا ذکر کیا ہے ۔ ہم قارئین کے لیے پہلے نظم درج کرتے ہیں اور پھر آگے بڑھتے ہیں :

''ضِدّ'' (نظم)

میں کیوں اُس کو فون کروں\
اُس کے بھی تو علم میں ہوگا\
کل شب\
موسم کی پہلی بارش تھی

(پروین شاکر)

نظم میں ایک مشرقی لڑکی کے کومل جذبے اور روایتی شرم وحیا کی جھلک نمایاں ہے ۔ مصنّف لکھتے ہیں :

> ''میں نے اُن کی ایک نظم سنا کر جس میں غالباً محبوبہ فریق ثانی سے اِس بات پر اِظہارِ افسوس کرتی ہے کہ آہ! میں تمھیں یہ نہ بتا سکی کہ کل موسم کی پہلی بارش تھی، یہ جرح کی کہ محترمہ! یہ فرمائیے، اِتنی اہم اطلاع اپنے محبوب کو دینے میں کیا امر مانع تھا؟'' (ص111)

اب قارئین خود فیصلہ کریں کہ کیا یہ سوال بنتا ہے؟ نظم میں افسوس کا اظہار کہاں ہے؟ محبوبہ نے یہ اطلاع دینے کی ضرورت ہی کب محسوس کی ، جو کوئی امر مانع ہوتا؟ نظم میں تو ایک مشرقی لڑکی کی ''انا'' اور پس پردہ چھپی شرم وحیا ہے ۔ بہرحال مصنّف نے اپنی دانست کے مطابق یہ سوال اُٹھایا تو مصنّف کے مطابق :

> ''پروین تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں ، غصّے میں کہا: '' آپ ابھی بچے ہیں ۔ان باتوں کو

نہیں سمجھیں گے۔'' (ص 111)

اِس جواب کا کیا رَدِّعمل ہوا؟ مصنّف کے بقول:

''ایسا تو نہیں تھا کہ میں نہیں سمجھتا تھا ان باتوں کو، عمر بھی بچوں کا باپ بننے والی ہو چکی تھی۔ پھر بھی کسی جوان اور حسین خاتون کی طرف سے ایک نوجوان کو یہ طعنہ دینا بڑی ہزیمت اور شرمندگی کی بات تھی۔ طلباء و طالبات نے بھی اِس جواب پر خوب شور مچایا اور کافی دِنوں تک اُن کا یہ طعنہ احباب میں موضوعِ گفتگو اور میرے دل میں برچھی بن کر ترازو رہا۔'' (ص 111)

مصنّف نے یہ کہا ہے کہ ''کافی دنوں تک یہ طعنہ دل میں برچھی بن کر ترازو رہا'' مگر لگتا یوں ہے کہ یہ برچھی ابھی تک دل میں اٹکی ہوئی ہے اور مصنّف ابھی تک اس ہزیمت اور شرمندگی کو بھول نہیں سکے۔

اِس ہزیمت کے علاوہ مصنّف کو اِس بات پر گِلہ اور شکایت ہے کہ پروین شاکر نے اُن کے کہنے پر اُنھیں روزنامہ ''جسارت'' کے لیے انٹرویو نہیں دیا تھا۔ حالانکہ مصنّف متعدد اہم ادیبوں کے انٹرویو ادبی صفحے کے لیے کر چکا تھا۔ مگر محترمہ نے صاف انکار کر دیا۔ اِس کا سبب تو مصنّف نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ اخبار میں مشفق خواجہ (خامہ بگوش) کے کچھ ایسے کالم چھپے تھے جو احمد ندیم قاسمی کے لیے خاصی دل گرفتگی کا باعث بنے تھے۔ (ص 111)

اور پروین شاکر نے اِسی بنیاد پر انکار کرتے ہوئے کہا تھا:

''جسارت'' اخبار کے لیے تو میں ہرگز انٹرویو نہیں دے سکتی، اس میں جو کچھ عمّو جان (قاسمی صاحب) کے بارے میں چھپتا رہا ہے، اس کے بعد آپ کیسے توقع رکھتے ہیں کہ میں اس اخبار کے لیے انٹرویو دینے پر آمادہ ہو جاؤں گی۔'' (ص 112)

اِس ''وفاداری'' پر موصوفہ کی تعریف و تحسین کی بجائے، مصنّف کو یہ انکار انتہائی ناگوار گزرا۔ جس کا اِظہار یوں کیا:

''خامہ بگوش کے کالم کی وجہ سے پورے ادبی صفحہ سے بے زاری کیوں؟ اگر ایسی ہی بیزاری ہے تو اس کا اظہار کر سکتی ہیں۔۔۔۔ میں قائل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا

مگر میں نے اِس کی ضرورت محسوس نہ کی اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ جیسی آپ کی مرضی۔''(ص112)

پروین شاکر کی ''مرضی'' تو یہاں ختم ہوگئی۔آگے مصنّف کی مرضی بلکہ کسی حد تک ''انتقام'' (تحفّظات) کا آغاز ہوتا ہے۔مصنّف کو پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ پروین شاکر نے:

''پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں سرخرو ہو کر اپنے لیے ایک ایسے محکمے کو ترجیح دی جو کم از کم شاعرہ کی طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے اَن مِل اور بے جوڑ تھا، مگر دُنیا میں کامیابی، ترقی اور تموّل کے لیے شاندار تھا۔''(ص109)

ہر شخص کو زندگی میں اپنے فیصلے کرنے کا حق ہے۔اُس کے لیے کیا بہتر ہے، کیا بہتر نہیں ہے، وہ خود زیادہ بہتر جانتا ہے۔کوئی پیشہ اُس کے مزاج اور شوق سے جوڑ رکھتا ہے یا نہیں، اِس کا فیصلہ اُس نے خود کرنا ہے۔کیا دُنیا میں کامیابی حاصل کرنا اور ترقی کرنا بھی جرم ہے؟ کیا اِس کے لیے بھی دوسروں سے اجازت حاصل کرنا اور اُن کی مرضی سے فیصلے کرنا ضروری ہے؟ پروین شاکر سے یہ ''جرم'' سرزد ہوا کہ اُس نے فیصلے کرتے ہوئے لوگوں کی مرضی کا خیال نہیں رکھا۔مصنّف نے بھی تحریر کیا ہے کہ پروین شاکر کو:

''جتنا ملا، قدرت کی مہربانی اور خود اُن کی محنت اور منصوبہ بندی سے ملا۔یہاں تک پہنچنے کے لیے بہت کچھ چھوڑنا پڑا۔ازدواجی اور سماجی زندگی کے بہت سے تقاضوں کو اپنی خواہشات پر نثار کرنا پڑا۔سو جب تک جیتی رہیں، غالباً مطمئن ہی رہیں کہ سودا خسارے کا نہ کیا۔''(ص106)

اِس اِقتباس میں مصنّف نے دو تین باتوں کو چُھوا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو ملا وہ قدرت کی مہربانی، محنت اور منصوبہ بندی سے ملا۔اگر کوئی بہتر زندگی کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کرے اور اس کے لیے محنت کرے اور پھر قدرت بھی مہربان ہو تو اور کیا چاہیے؟ اِس طرح جو کچھ اُسے ''ملا'' مصنّف اِس بات پر متفق ہے۔لیکن اگلے ہی جملے میں اعتراض اُٹھا دیا کہ اس کے لیے اُسے ازدواجی اور سماجی زندگی کے تقاضوں کو اپنی

خواہشات پر نثار کرنا پڑا۔مصنّف نے یہ جملہ لکھنے سے پہلے نہ پوری طرح سوچ بچار سے کام لیا اور نہ پوری تحقیق کی۔اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے پروین شاکر نے ازدواجی اور سماجی زندگی کے تقاضوں کو ہرگز پامال نہیں کیا۔اِس سلسلے میں عرفان جاوید صاحب کی رائے یہ ہے کہ:

''پروین نے مقابلے کے امتحان سی ایس ایس میں بیٹھنے کا اِرادہ کیا تو نصیر (اُس کے شوہر) نے اُس سے بھرپور تعاون کیا۔امتحان کی اجازت دی اور تیاری کے دوران سہارا دیا۔۔۔۔۔۔۔۔اُس نے پروین کو مشاعروں میں شرکت کی قطعی اجازت دے رکھی تھی۔کئی ادبی محافل میں ساتھ بھی ہوتا اور اُس کی کامیابی پر خوش ہوتا۔''(3)

پروین شاکر کی خواہشات، شاعری اور زندگی میں کامیابی اور ترقی، ان امور کی تکمیل کے لیے اُسے اپنے شوہر کا مکمل تعاون حاصل ہے، تو پھر اس پر یہ اعتراض کس بنیاد پر ہے کہ اُس نے ازدواجی اور سماجی تقاضوں کو اپنی خواہشات پر نثار کر دیا؟ البتہ اِس اِقتباس سے یہ بات کھٹکتی ہے کہ عورت کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے مرد کی ''اجازت'' درکار ہے اور اگر اجازت مل بھی جائے تو معترضین کے اعتراض پھر بھی باقی ہی رہتے ہیں۔

طاہر مسعود صاحب مزید اعتراض اُٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سُننے میں آیا تھا کہ میاں اچھی طبیعت کے ہیں لیکن ''بیگم'' کی شاعرانہ سرگرمیوں اور میل جول سے خوش نہیں ہیں۔ازدواجی زندگی پروین کی اُلجھنوں اور تلخیوں کا شکار رہی۔ان کے سامنے اپنا شاندار ''کیریر'' تھا۔کیریر کی دوڑ دُنیا میں کامیابی کی دوڑ ہوتی ہے، جس دوڑ میں پروین شریک تھیں۔''(ص112)

''بیگم'' کی شاعرانہ سرگرمیوں اور ''کیریر کی دوڑ'' کا ذکر کر کے مصنّف نے ازدواجی زندگی کی اُلجھنوں اور تلخیوں کی مکمل ذمہ داری پروین شاکر کو ٹھہرایا ہے۔اور علیحدگی کے عمل کے بارے بھی یہی کہا ہے کہ وہ مطمئن تھی کہ اُس نے سودا خسارے کا نہ کیا۔

مرد یہ جملے بڑی آسانی سے لکھ سکتا ہے۔اُسے اِس بات کا احساس غالباً ہو ہی نہیں سکتا کہ

عورت کا گھر اُجڑے تو اُس پر کیا گزرتی ہے؟ طلاق، عورت کی زندگی میں کیا زہر گھولتی ہے اور علیحدگی اُس کی زندگی کا کتنا بڑا ''عذاب'' بن جاتی ہے۔ مرد اِس عذاب کی شِدّت سے واقف ہو ہی نہیں سکتا۔ اور پھر وہ مرد جس کے دل میں ''طعنہ'' برچھی بن کر تراز و ہو، وہ تو یہی لکھے گا کہ وہ مطمئن تھی اور سمجھتی تھی کہ اُس نے ''خسارے کا سودا'' نہیں کیا۔ پروین شاکر پر علیحدگی کے بعد کیا گزری؟ اور اچھی طبیعت کے ''میاں'' کا رویّہ کیسا رہا؟ سسرال کا رویّہ کتنا ''وحشت ناک'' تھا؟ کاش مصنّف محترمہ رفاقت جاوید صاحبہ کی کتاب ''پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا'' کا مطالعہ کر لیں۔ تفصیل تو کتاب میں موجود ہے، یہاں صرف ایک دو اقتباسات درج کرنا ضروری ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ علیحدگی کا فیصلہ پروین شاکر نے کیا تھا یا اچھی طبیعت والے ''میاں صاحب'' کا بھی اس میں کوئی قصور ہے یا نہیں؟ مصنّفہ محترمہ رفاقت جاوید صاحبہ لکھتی ہیں کہ مراد کی پیدائش کے وقت:

> ''نصیر رشتہ داروں اور ''ماں'' کے کہنے پر ''مراد'' کو دیکھنے میں تاخیر کرنے لگے۔ البتہ پروین کے رونے دھونے پر اُن کی تشریف آوری ہوئی۔''(4)

یہ ''اچھے میاں'' ماں کے کہنے پر ایسا رویّہ کیوں اختیار کیے ہوئے تھے؟ طاہر مسعود صاحب کو اِس امر کی تحقیق کرنا چاہیے۔ اور پھر ایک دوسرا اِقتباس بھی ملاحظہ فرمالیں۔ پروین کو:

> ''سسرال کے ہر رشتے سے ''وحشت'' محسوس ہوتی تھی اور وہ اُن کے ذکر ہی سے خوف زدہ ہو جایا کرتی تھی۔''(5)

پروین شاکر کو ان سسرالی رشتوں سے ''وحشت'' کیوں محسوس ہوتی تھی اور کس بات سے ''خوف زدہ'' تھی؟ کیا طاہر مسعود صاحب ''بیگم'' کی شاعرانہ سرگرمیوں اور کیریر کی دوڑ کا الزام لگانے اور اس ''سودے بازی'' کا ذکر اور پروین شاکر کے ''اطمینان'' کے ساتھ ساتھ کبھی ''اچھے میاں'' اور سسرالی رویّوں کے بارے بھی غور فرمائیں گے؟

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اِس خاکے میں انصاف نہیں بلکہ انتقام کی جھلک ہے۔ ایک خاتون جو اِس دُنیا سے کوچ کر چکی ہو، بلا تحقیق اُس پر کیریر کی دوڑ میں شرکت اور دنیاوی کامیابی کے لیے ''اچھے میاں'' سے علیحدگی، رشتوں کے تقدّس اور سماجی زندگی کے تقاضوں کی نفی کا

الزام تھوپ دینے سے ممکن ہے اپنی کوفت اور اذیت میں کمی آنے کی توقع کا اِمکان ہو، اور دل میں جو برچھی ترازو ہوئی تھی اُس کی کسک سے افاقہ نصیب ہونے کا کوئی پہلو ہو، مگر یہ مشرقی روایت کی سراسر نفی ہے اور اہلِ کراچی کے حسد کی کہانی ہے۔ یہ خاکہ مرد شاونزم کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اور پتہ نہیں مرد کو اِس بات پر فخر کرنا چاہیے یا شرمندہ ہونا چاہیے؟

حواشی

1۔ طاہر مسعود، خاکہ بعنوان ''خوشبو کی ہجرت''، مشمولہ ''ادبِ عالیہ (کتابی سلسلہ) کراچی، ادبِ عالیہ پبلی کیشنز، مارچ، 2017ء

2۔ رفاقت جاوید، ''پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا''، اسلام آباد، پروین شاکر ٹرسٹ، 2011ء ص56

3۔ عرفان جاوید، مضمون ''پارو''، لاہور، روزنامہ ''جنگ'' سنڈے میگزین، 23 اکتوبر، 2017ء ص9

4۔ رفاقت جاوید ''پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا''، ص100

5۔ ایضًا ص176

طاہر مسعود

پروین شاکر۔۔۔خوشبو کی ہجرت

پروین شاکر سے میری کبھی دوستی رہی نہ ایسے مراسم ہی رہے کہ اُنھیں قریب سے دیکھا ہو، اور اُن کی عادات و اطوار کا بہ غور مشاہدہ کیا ہو۔ پھر بھی اُن پر خاکہ لکھنے بیٹھا ہوں تو کیوں؟ نہیں کہہ سکتا کہ کیوں؟ کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔ بس یوں سمجھ لیں کہ دو تین ملاقاتوں اور اُن کی بابت بہت کچھ جاننے کے بعد بھی جب اُن کی حادثاتی موت یاد آتی ہے، عین اُس وقت جب اُن کی تقدیر کا ستارہ وقت کے آسمان پر جگمگا رہا تھا، شہرت و مقبولیت کی خوشبو پھیلتی جاتی تھی کہ دستِ قضا نے اُنھیں اُچک لیا۔ وہ بھی اِس طرح کہ دوست دشمن بھی بھونچکا رہ گئے۔ ادب میں زندگی میں وہ دُور تک نکل چکی تھیں، گمان تھا کہ ابھی زندگی پڑی ہے، اور آگے جائیں گی۔ کہاں تک؟ یہ تو کسی نے بھی نہ سوچا تھا۔ ہوسکتا ہے اُن کے ذہن میں، اُن کے اپنے دل میں ترقی کی اور تمنّا ہو۔ بہت سے خواب ہوں جو پورے نہ ہو سکے۔ تقدیر میں جتنا لکھا تھا، مِل گیا اور کتنا صِلہ باقی تھا، اس کی خبر تو کسی کو نہ تھی، نہ ہے۔ خود اُنھیں بھی نہیں۔ جتنا ملا قدرت کی مہربانی اور خود اُن کی محنت اور منصوبہ بندی سے ملا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے اُنھیں بہت کچھ چھوڑنا پڑا۔ ازدواجی اور سماجی زندگی کے بہت سے تقاضوں کو اپنی خواہشات پر نثار کرنا پڑا۔ سو جب تک جیتی رہیں، غالباً مطمئن ہی رہیں کہ سودا خسارے کا نہ کیا۔ جو کچھ چاہا دُنیا سے، معاشرے سے، محرومی کا سامنا تو نہ ہوا لیکن ایک تخلیقی روح کیا چاہتی ہے، اس کا سکون و اطمینان کہاں چُھپا ہے، تخلیق کے عمل میں، شہرت اور کامیابیوں میں چاہے جانے اور تسلیم کیے جانے میں؟ اِس کا جواب کوئی دوسرا تو کیا دے گا خود اُس آدمی کے پاس بھی بسا اوقات نہیں ہوتا جسے ایسے سوالات کا سامنا ہوتا ہے۔

یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں جب کیمپس طالب علم ادیبوں اور شاعروں اور ادب

میں دل چسپی لینے والوں سے آباد تھا، محمود کنور، شوکت عابد، انورسن رائے، عذرا عباس، فاطمہ حسن، تنویرا انجم، اظہر نیاز، احمد فواد، ناظمہ طالب اور ایسے بہت سے دوسرے، کبھی کیفے ٹیریا، کبھی ہرے بھرے لان پہ شیشم کے پستہ قامت درختوں کے نیچے، کبھی لائبریری اور کبھی آرٹس لابی میں بیٹھے ادب و شاعری پر باتیں کرتے ہوئے اکثر پروین شاکر اور اُن کی شاعری زیرِ بحث آجاتی تھی۔ تب تک پروین انگریزی ادب میں ایم اے کر کے جا چکی تھیں۔ اُن کی غزلیں پابندی سے ''فنون'' میں چھپا کرتی تھیں اور احمد ندیم قاسمی جو نئے لکھنے والوں کی ایسی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ جس کی حوصلہ افزائی کرتے وہ خود کو آسمانِ ادب پہ محوِ پرواز محسوس کرنے لگتا۔ اس کا قیاس اِس بات سے کیجیے کہ جب اِس خاکسار کی کہانی اُنھوں نے پہلی مرتبہ فنون میں شائع کی ''سمندر کی جیل'' تو اِداریے میں افسانہ نگار کا تذکرہ کسی ایک اور خاتون ادیبہ (جن کا نام بھول گیا ہوں) کے ساتھ ایسے کیا کہ ایک وقت آئے گا جب لوگ ان دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں کے لیے فنون کے شمارے لائبریریوں میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ ذرا سوچیے کہ ہمارا کیا حال ہوا ہوگا؟ تو پروین شاکر کی حوصلہ افزائی میں بھی اُنھوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ خود قاسمی صاحب جب نوجوان تھے اور ادب کو اپنا اسلوبِ زندگی بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے تو اُن کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور اُس زمانے کے دیگر مشاہیر نے بڑھ چڑھ کر کی جس کا تذکرہ اُنھوں نے حسرت پر اپنے شخصی خاکے میں کر رکھا ہے تو جس ادبی ماحول سے اُنھیں جو کچھ مِلا، جو کچھ اُنھوں نے سیکھا، اُس قرض کو لوٹانے میں ساری زندگی قاسمی صاحب نے گزار دی۔ پروین شاکر اُنھیں محبتاً اور احتراماً عمّو جان کہا کرتی تھیں اور قاسمی صاحب بھی اُن سے ایک چہیتی بیٹی کی طرح شفقت فرماتے تھے۔ یونی ورسٹی کے جس دور کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اُس وقت تک پروین شاکر ادب میں اپنا مقام بنانے کے لیے نہایت سنجیدگی سے کوشاں تھیں۔ مشاعروں میں خصوصاً ریڈیو کے مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتی تھیں۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ ہم لوگوں کی ادبی بیٹھکوں میں اُن کا ذکر کبھی عمدگی سے نہ ہوا۔ جب بھی ہوا اُن کی شاعری

کی نفی اور اُن کی شاعرانہ صلاحیت کے انکار سے ہوا۔ مَیں محسوس کرتا تھا کہ اِس نفی و انکار کے پیچھے رشک و حسد کا خفیف سا جذبہ چھپا ہے۔ کیوں کہ پروین باوجود اپنی پستہ قامتی کے بہرحال خوب صورت کہی جاسکتی تھیں۔ پھر عام پڑھنے والوں میں اُن کے لیے پسندیدگی اور تحسین و ستائش کے جذبات بھی پائے جاتے تھے۔ قاسمی صاحب کی حوصلہ افزائی بھی بہت سوں کی ناخوشی کا سبب تھی۔ ہمارے حلقے میں اُن کی ناپسندیدگی کو جو ادبی رنگ دیا جاتا تھا، وہ یہ تھا کہ روایتی شاعرہ ہیں۔ غزلوں میں متوسط طبقے کی ایک نوجوان لڑکی کے رومانی جذبات کی ترجمان ہیں اور بس۔ اُن دِنوں کراچی میں نثری نظم کی تحریک چل رہی تھی، اُس کے سرخیل جناب قمر جمیل تھے۔ وہ بھی جدیدیت کی رَو میں پروین شاکر کی شاعری کی بابت کوئی بہت اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور جب ادب کے ''گاڈ فادر'' ہی سے سَنَد نہ ملی ہو تو پروین شاکر ''گاڈ فادر'' کی اُمّت یا اُن کے حواریوں میں کیسے پسندیدہ اور اہم ٹھہرتیں؟ میں نے چونکہ پروین کا کلام پڑھا ہی نہیں تھا تو مَیں کوئی کیا رائے رکھتا۔ لیکن گرد و پیش سے اُن کی شاعری کو شدّ و مد سے مسترد کرنے کی جو صدائیں سُنتا تھا، اُس سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ اُن کے کچھ اشعار اُس زمانے میں زبان زدِ خاص و عام ہونے لگے تھے۔ مثلاً ''میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دُلھن سجاؤں گی'' یا ''بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے'' وغیرہ۔

پہلی بار پروین کو میں نے ریڈیو کے ایک مشاعرے میں دیکھا۔ ''بزمِ طلبا'' جو باصلاحیت طلبا کی شاندار تربیت گاہ تھا اور جس میں آئے دن ادبی پروگرام ترتیب دیے جاتے تھے۔ چونکہ پروگراموں میں شرکت کا معاوضہ بھی ملتا تھا تو ''کڑکی'' کے اس زمانے میں ہم لوگ اسی شوق میں کیمپس سے سیدھے بندر روڈ کی گُنبد نما عمارت کے اندر ایک درخت کے سائے کو عبور کرتے ہی ''بزمِ طلبا'' کا کمرہ آجاتا تھا جس میں ضمیر علی بدایونی اور عصمت زہرہ براجمان ہوتے تھے۔ طلبہ آتے، چائے کا دَور چلتا رہتا اور اُوپر اسٹوڈیو میں پروگرام ریکارڈ ہوتے رہتے۔ تو جس مشاعرے میں پروین شاکر سے ملاقات ہوئی، اُس میں مَیں بھی مدعو تھا۔ پروین شلوار قمیص اور سر

پر دوپٹہ رکھے مشاعرے میں شریک ہوئیں، تب تک اُن کے اندر ایک سادگی اور متوسط گھرانے کی لڑکیوں کا رکھ رکھاؤ اور تمیز و تہذیب میں نے دیکھی۔ مشاعرے کے بعد اُنھیں گھر جانے کے لیے رکشہ پکڑنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ مَیں نے اِس سلسلے میں از راہِ ہمدردی اپنی خدمات پیش کیں۔ ممنونیت کے ساتھ اُنھوں نے میری پیش کش کو قبول کیا۔ پھر ہم اسٹوڈیو کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے بندر روڈ پر آ گئے۔ رستے میں اُن سے باتیں بھی ہوتی رہیں جو اَب مجھے یاد نہیں۔ ذرا سی کوشش پر ایک رکشے والا اُنھیں اُن کے گھر غالباً فیڈرل بی ایریا لے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ رکشے پر بیٹھ کر اُنھوں نے خوش دلی سے ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہا اور مَیں اپنی اُس ''نیکی'' پر شاداں و فرحاں ''بزمِ طلبا'' کے کمرے میں لوٹ آیا۔

اُن کی شاعری ایک بار پھر ہماری بیٹھکوں کا موضوع بنی جب اُن کا شعری مجموعہ ''خوشبو'' چھپ کر آیا۔ اس کی تقریبِ رونمائی بھی آرٹس کونسل میں دھوم دھام سے ہوئی۔ ہمارے کرم فرم اور دوست جناب سجّاد میر جن کی پروین شاکر سے قربت تھی کہ پروین اُن کا احترام بڑے بھائی کی طرح کرتی تھیں۔ وہ بھی اِس جلسے میں بولے اور خوب بولے۔ مَیں تو تقریب میں گیا نہیں تھا، میر صاحب ہی سے رُوداد معلوم ہوئی کہ آرٹس کونسل میں اُس روز عید کا سماں تھا تو گویا وہیں سے پروین شاکر کی مقبولیت کے ادبی طیارے نے ٹیک آف کیا اور اونچے آسمانوں کی طرف اُڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ کراچی کے ادیبوں، شاعروں کی رسائی سے بھی باہر ہو گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کے دو ایک واقعات کا تذکرہ ضروری ہے۔

''خوشبو'' کا منظرِ عام پر آنا، شہر کراچی کی ادبی زندگی کا ایک قابلِ ذکر واقعہ تھا۔ نثری نظم کے زیرِ اثر نوجوان شعرا نے تو اسے ''ہُنھ یہ رومانی شاعری کہہ کر جھٹک دیا۔ البتہ مجھے یاد ہے کہ محمود کنور اِسی تحریک میں غیر رسمی طور پر شامل واحد شاعر تھے، جنھوں نے ایک دن مجھ سے کہا: ''یار! ''خوشبو'' میں تو پروین شاکر نے بڑے شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں۔ یہ جو لوگ اُس کی شاعری کو سنجیدگی سے لینے کے لیے تیار نہیں ہیں، یہ پروین جیسا ایک مصرع تو کہہ کر دکھائیں۔''

اب محمود کنور میرے ادبی مربی تھے، سچّی بات تو یہ ہے کہ آنرز سال اوّل میں جب مَیں نے داخلہ لیا تھا تو میرا مطالعۂ شاعری اِس قدر محدود اور ادب پہ میری نظر اتنی سرسری سی تھی کہ مَیں ساحر لدھیانوی کی نظموں کے سحر میں ڈوبا اُن ہی کو سب سے بڑا شاعر گردانتا تھا۔ یہ محمود کنور تھے جنھوں نے میرے ناقص ادبی تصوّرات کی اصلاح کی اور مجھے ادب کی گہرائی و گیرائی سے آشنا کیا۔تو جب اُنھوں نے پروین شاکر کی شاعری کو رعایتی نمبروں سے نہیں شاندار الفاظ میں تعریف وتوصیف سے نوازا تو مَیں بھی سوچنے پر مجبور ہوا کہ پروین کی شاعری سے بے التفاتی جدیدیت زدہ حلقوں میں یقیناً غیر ادبی وجوہ کی بنا پر ہے۔ ورنہ اُن کی شاعری کی بابت یہ رائے کہ پروین شاکر نے اُردو شاعری کو نسائی لمس سے آشنا کیا ہے، بڑی حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ اِس رائے سے اتفاق بھی بہت بعد میں، جب مَیں نے اُن کے شعری مجموعوں کو توجہ سے پڑھا تو کیا۔

ایم اے میں پہنچ کر مَیں نے اپنے سینیئر دوست طارق محمود میاں کی پیش کش پر اُن کا جاری کردہ نیا رسالہ ”عقاب“ جوائن کر لیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد پروین شاکر نے ادبی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے لیے بھارت کا سفر اختیار کیا جہاں اُن کا سواگت قرۃ العین حیدر نے یہ کہہ کر کیا کہ: ”ارے لڑکی! اتنی چھوٹی سی ہو کر تُو نے اِتنا سارا اچھا کلام کیسے کہہ دیا۔“ پروین واپس آئیں تو ”عقاب“ کے کئی شمارے نکل چکے تھے۔ طارق محمود میاں جن کی غالباً پروین سے پہلے سے واقفیت تھی، اُن سے پروین نے ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔ ہند یاترا کے دوران اپنی پذیرائی کی داستان سنائی تو طارق صاحب نے اُنھیں سفرِ ہند کا سفرنامہ ”عقاب“ میں لکھنے کی راہ سجھائی۔ شاید پروین کے دل کی یہ بات تھی، فوراً ہی رضامند ہو گئیں۔ یوں ”امن کے سترہ دن“ کے عنوان سے اُن کا قسط وار سفرنامہ رسالے میں چھپنے لگا۔ میں اِس سفرنامے کو بہت دل چسپی سے پڑھا کرتا تھا، اِس لیے بھی کہ اِس میں میری محبوب مصنفّہ عینی کا تذکرہ خاصا تھا۔ لیکن مطالعے کے دوران جو چیز مجھے کھٹکتی تھی، وہ پروین کی نرگسیت، اُن کی خود پسندی تھی، اپنی اہمیت کے اظہار کا جا و بے جا احساس تھا۔ اُن دِنوں عینی خوشونت سنگھ کی ادارت میں ”السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا“ سے وابستہ تھیں۔

چوں کہ پروین پاکستان سے آئی تھیں، مہمان تھیں، شاعرہ بھی تھیں، انگریزی رسالے کے قارئین سے اُنھیں متعارف کرانے کے لیے عینی نے اُن پر رسالے کے فوٹوگرافر کو بلا کر تصویریں وغیرہ کھنچوائیں تا کہ اُن کا ایک تصویری فیچر چھاپنے کے لیے تیار کیا جا سکے۔ اِس واقعے کو پروین نے اپنے سفرنامے میں نہایت خود پسندی کے جذبے کے ساتھ اِس طرح بیان کیا جیسے عینی بیگم کراچی سے آئی ہوئی ایک Celibrity کو اپنے قارئین سے کیش کرانے کے لیے اُن پر لہالوٹ ہوگئی ہوں۔ ایک مقام پر تو پروین نے حد ہی کر دی۔ اُنھوں نے لکھا کہ ''بات گھوم پھر کر لتا منگیشکر پر آئی تو میں نے لتا سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا تو عینی بولیں لتا کی آواز۔ اُس کی آواز تو Shril voice (سیٹی نما آواز) ہے۔ اِس سے اچھی تو آشا بھوسلے کی آواز ہے۔ یہ سُن کر مجھے بے اختیار نصیر ترابی کا تبصرہ یاد آیا جنھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ لتا گاتی ہے تو لگتا ہے کوئی دیوی گا رہی ہے، رہی آشا بھوسلے تو اس کی گائیکی تو کسی کلب کی ڈانسر جیسی ہے۔'' پروین کے الفاظ تو ظاہر ہے کچھ اور رہے ہوں گے لیکن مفہوم یہی تھا۔ مجھے اِن باتوں سے شدید اذیت اور کوفت ہوئی۔ میں اگر رسالے کا ایڈیٹر ہوتا تو یقیناً اُردو کی ایک عظیم ادیبہ کے احترام کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے یہ ساری باتیں سفرنامے سے حذف کر دیتا۔ مجھے حیرت اِس بات پر تھی کہ کیا پروین جنھوں نے بہ قول سجاد میر اُردو اور انگریزی ادب کو کسی مخلص اور محنتی طالبہ کی طرح سبقاً سبقاً پڑھا تھا، کیا اُردو ادب میں عینی آپا کے مقام سے بالکل ہی بے خبر و ناواقف تھیں؟ یقیناً ایسا نہیں تھا لیکن المیہ یہ تھا کہ عینی آپا کے جذبہ دلداری و انکسار و محبت کو اُن کی خود پسندی اور نرگسیت نے کچھ اور ہی معنی پہنا دیے۔ اُس دن میری کوفت اور اذیت دُور ہوئی جب ایک عرصہ بعد انتظار حسین بھارت گئے اور واپسی پر اُن کا سفرنامہ ایک ادبی رسالے میں چھپا۔ انتظار صاحب نے قرۃ العین حیدر سے اپنی ملاقات کے تذکرے میں لکھا کہ اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ انتظار صاحب! پاکستان سے جو بھی آتا ہے، میں اُس سے خلوص و محبت سے ملتی ہوں لیکن جانے لوگ کیا سمجھ لیتے ہیں۔ پچھلے دِنوں ایک چھوکری پروین شاکر آئی تھی، اُس سے میں اچھے سے ملی؛ اُس نے واپس جا کر جانے کیا کیا اُلٹی سیدھی باتیں

میرے بارے میں لکھ دیں۔عینی آپا کے غصّے کی وجہ صرف ’’عقاب‘‘ کا سفرنامہ ہی نہ تھا(عقاب کے مذکورہ شمارے اُن کی ایک عزیزہ غالباً نیلوفر حیدر نے اُنھیں دِلّی بھجوا دیے تھے)۔پروین نے اُن پر ایک نظم بھی لکھ ماری تھی۔نظم میں عینی کا تاثر ایک تنہائی اور اُداسی میں گھلتی ہوئی عورت کا اُبھرتا تھا جس کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔

سُنا ہے انتظار صاحب کے سفرنامے میں عینی کا تکلیف دِہ تبصرہ پڑھ کر پروین نے اُنھیں ایک خط لکھا۔معلوم نہ ہو سکا کہ خط میں کیا لکھا تھا،معذرت کی تھی،اپنی نظم اور سفرنامے کی وضاحتیں پیش کی تھیں یا شکوے کیے تھے۔بہرحال یوں وہ دن پروین کی پرواز کے تھے۔پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں سرخرو ہو کر اُنھوں نے اپنے لیے ایک ایسے محکمے کو ترجیح دی جو کم از کم ایک شاعرہ کی طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے ان مِل اور بے جوڑ تھا۔مگر دُنیا میں کامیابی،ترقی اور تموّل کے لیے شاندار تھا۔

یونیورسٹی میں طلبا یونین کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ہر سال ہفتۂ طلبا منایا جاتا تھا جس میں مباحثے،مشاعرے اور ادبی عدالتیں لگتی تھیں۔اُس برس یونین نے ادب اور ادیبوں پر مقدمہ دائر کرنے کے لیے ادبی عدالت لگائی۔ادبی برادری کی نمائندگی کے لیے جن دو شخصیتوں کو مدعو کیا گیا اُن میں ایک تو مشہور جاسوسی ناول نگار اور شاعر اِبنِ صفی تھے جن کی ایک غزل ’’راہ طلب میں کون کسی کا، اپنے بھی بیگانے ہیں‘‘ حبیب ولی محمد نے اپنی سُریلی آواز میں نہایت عمدگی سے گائی تھی جو سننے والوں کے دِلوں کو اپنی مُٹھی میں لے لیتی تھی۔دوسری یہی پروین شاکر تھیں۔وکلائے استغاثہ میں جمیعت طلبہ کے معروف طالب علم لیڈر اور مقرّر حسین حقّانی تھے جو بعد میں امریکا میں پاکستان سے زیادہ امریکا ہی کے لیے سفارت کاری کا فریضہ نہایت خلوص سے انجام دِیا کیے۔یہ خاکسار بھی وکلائے استغاثہ میں شمولیت کا گنہ گار تھا۔وکلائے صفائی سجّاد میر اور شوکت عابد تھے۔ادبی عدالت کے جج نقّاد اور اُردو اَدب کے اُستاد ڈاکٹر ابوالخیر کشفی تھے۔یونی ورسٹی کیمپس کے کانووکیشن گراؤنڈ میں ہوا سے پھڑ پھڑاتے وسیع و عریض شامیانے کے اندر

ہزاروں طلبا و طالبات جمع تھے۔ وہ سب ادبی عدالت میں ادب اور ادیبوں کا انجام دیکھنے اور جو نوک جھونک، فقرے بازی وغیرہ ایسے موقعوں پر فریقین میں ہوتے ہیں، اُن سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔ پروین شاکر پنڈال میں داخل ہوئیں تو ایک لمحے کے لیے مَیں اُنھیں پہچان نہ سکا۔ گہرے میک اپ اور زرق برق ساڑھی میں ملبوس جب سج سج چلتی اسٹیج کی سیڑھیاں اُنھوں نے عبور کیں تو مَیں سر کو دوپٹے سے چھپائے سادہ سے کپڑوں میں اُس پروین کو ڈھونڈتا اور یاد کرتا رہ گیا جسے مَیں نے بندر روڈ کی پُرہجوم سڑک پہ ایک پرانے سے سال خوردہ رکشے پر سوار کرایا تھا اور رکشے والے سے کرائے پر کچھ حُجّت بھی کی تھا۔ وقت کیا سے کیا کر دیتا ہے آدمی کو۔ کبھی سادگی سے بناوٹ کی طرف اور کبھی بناوٹ اور سجاوٹ کو یک لخت ترک کر کے سادگی اور ہدایت کی طرف۔ آدمی کیا ہے۔ جھولتا ہوا پنڈولم ہے، کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ آدمی کے وجود کی گھڑی میں چابی کون بھرتا ہے، ٹک ٹک کرتی گھڑی کو متحرّک رکھنے کے لیے بیٹری کون ڈالتا اور بدلتا ہے۔ کون جانے۔ وکلائے استغاثہ کے طور پر حقّانی اور مجھے ملزمان اِبن صفی اور پروین شاکر پر جرح بھی کرنی تھی۔ مقدّمہ دائر ہو چکا تھا، الزام یہ تھا کہ ادیبوں نے قلم کا حق ادا نہیں کیا، عوام کی ذہنی اور جذباتی تہذیب و تربیت نہیں کی، کبھی فحش اور کبھی مہمل تحریروں کا انبار لگا کر پڑھنے والوں کو گمراہ یا مایوس کیا وغیرہ۔ حقّانی منجھے ہوئے مقرّر تھے، طبیعت میں مزاح کا عنصر بھی تھا چناں چہ اُنھوں نے اپنے دلائل کے حق میں دو ایک گواہان بھی پیش کیے۔ ابن صفی پر جرح کرتے ہوئے اُنھوں نے طیّارہ کے اغوا کے ایک ملزم کو پیش کیا جس نے جرح کے جواب میں اعتراف کیا کہ اُس نے اِبن صفی کا ایک ناول پڑھ کر طیّارہ اغوا کرنے کا پلان بنایا۔ اُن ہی دِنوں پی آئی اے کا ایک طیّارہ اغوا کیا گیا تھا جسے اِدارے کے سربراہ ایئر مارشل (ر) نور خان نے بڑی بہادری سے مذاکرات کے بہانے جا کر اغوا کنندہ کو قابو میں کر کے طیّارہ چھڑا لیا تھا۔ اِبن صفی نے یہ سُن کر کہ اُس کا ناول ایک طیّارے کے اغوا کا محرّک بنا، برجستگی سے فرمایا، ''بُرے لوگ میرے ناول سے برے نتائج اخذ کرتے ہیں اور اچھے لوگ، اچھے۔ ایئر مارشل نور خان نے میرا ناول پڑھ کر وہی کیا جو میرے

ناولوں میں کرنل فریدی کا کردار رہا ہے۔'' اِس پر بہت تالیاں بجیں۔ میری باری پہ اِس سوال کے جواب میں کہ ادیب تو آپ کو ادیب ہی تسلیم نہیں کرتے۔ آپ کے ناولوں کو سنجیدہ ادب کا حصّہ ہی نہیں سمجھا جاتا تو آپ خود کو ایشیا کا مقبول ناول نگار کیسے لکھواتے یا سمجھتے ہیں؟ ابنِ صفی نے اِس کا نہایت دل چسپ جواب دیا۔ کہنے لگے: ''جو بڑے ادیب مجھے ناول نگار نہیں تسلیم کرتے آپ اُن کے بستر کے تکیے ہٹائیں گے تو نیچے سے میرے ہی ناول برآمد ہوں گے!''

پروین شاکر کٹہرے میں آئیں تو میری جرح کے دوران تلخی کا شکار ہو گئیں۔ وہ تلخ ہونے میں حق بجانب تھیں کہ میری جرح کا ایک سوال ہی احمقانہ تھا۔ جرح کے سوالات مرتّب کرتے ہوئے میں نے طارق صاحب سے مشورہ کیا تھا، اُنھوں نے کہا پروین سے یہ ضرور پوچھنا کہ اُنھوں نے اپنے شعری مجموعے کا نام ''خوشبو'' کیوں رکھا۔ ''بدبو'' کیوں نہ رکھا؟ مَیں شامت کا مارا، سوال کی حقیقت پر غور کیے بغیر پوچھ بیٹھا۔ پروین تو تلملا گئیں۔ کوئی سخت سا جواب دیا۔ پھر میں نے اُن کی ایک نظم سنا کر جس میں غالباً محبوبہ فریق ثانی سے اِس بات پر اِظہارِ افسوس کرتی ہے کہ آہ! مَیں تمھیں یہ نہ بتا سکی کہ کل موسم کی پہلی بارش تھی، یہ جرح کی کہ محترمہ! یہ فرمائیے اِتنی اہم اطلاع اپنے محبوب کو دینے میں کیا امر مانع تھا؟ پروین تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔ غصّے میں کہا: ''آپ ابھی بچے ہیں، اِن باتوں کو نہیں سمجھیں گے!''

ایسا تو نہیں تھا کہ مَیں نہیں سمجھتا تھا ان باتوں کو، عمر بھی بچّوں کا باپ بننے والی ہو چکی تھی۔ پھر بھی کسی جوان اور حسین خاتون کی طرف سے ایک نوجوان کو یہ طعنہ دینا بڑی ہزیمت اور شرمندگی کی بات تھی۔ طلبا و طالبات نے بھی اِس جواب پر خوب شور مچایا۔ اور کافی دِنوں تک اُن کا یہ طعنہ احباب میں موضوعِ گفتگو اور میرے دل میں برچھی بن کر ترازو رہا۔ کتنے خوب صورت دن تھے وہ بھی۔ کیسی کیسی یادیں ہیں جنھیں سمیٹنے بیٹھو تو اپنا وجود بکھر بکھر سا جاتا ہے، یہ سوچ کر کہ کبھی لوٹ کر نہیں آسکیں گے وہ دن، وہ دھوپ بھری دوپہریں، وہ ہنسی ٹھٹھے، وہ زندگی کی گہما گہمی، سب کچھ مٹ گیا، اب تو فائرنگ کی دل دوز چیخیں اور بموں کے دھماکوں میں جسموں کے اُڑتے ہوئے چیتھڑے ہیں۔ وہ یونی ورسٹی رہی اور نہ وہ تربیتی و تہذیبی ادارے اور پروگرام رہے۔ بہر کیف،

بات پروین شاکر کی ہو رہی تھی۔ آخری بار میری گفتگو پروین سے بہت برس بعد ٹیلی فون پر ہوئی۔ میں یونی ورسٹی کو خیر باد کہہ کر روز نامہ ''جسارت'' سے وابستہ ہو چکا تھا۔ متعدد اہم ادیبوں کے انٹرویو ادبی صفحے کے لیے کر چکا تھا۔ صفحے پر خواجہ صاحب (مشفق خواجہ) خامہ بگوش کے قلمی نام سے ادبی کالم رقم فرماتے تھے۔ اُن دِنوں مشق ستم دبستانِ فنون اور دبستانِ سرگودھا کے تنازعات کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی صاحب تھے۔ خواجہ صاحب کے کالم اُن کے لیے خاصی دل گرفتگی کا باعث تھے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ خامہ بگوش کے نقاب تلے کون ہے؟ چناں چہ اُن کا ایک شکایتی پیغام خواجہ صاحب کو ملا تو اُن کی شکایت دور کرنے کے لیے خواجہ صاحب کو کچھ اور نہ سوجھا تو اُنھوں نے خاکہ نگار اور محقق جناب حمزہ فاروقی کی آمادگی و اجازت سے اُن کی طرف سے ادبی صفحے پر یہ خط شائع کرا دیا جس میں حمزہ صاحب نے یہ اعتراف و اعلان کیا کہ ''سخن در سخن'' کا کالم خامہ بگوش کے نام سے میں لکھتا ہوں وغیرہ۔ واقفانِ حال جانتے تھے کہ ایسی کاٹ دار نثر لکھنے کی صلاحیت کراچی کیا پورے ملک میں خواجہ صاحب کے سوا کسی اور میں ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا اُن کا یہ تیر بھی خالی گیا۔ حالاں کہ خواجہ صاحب نے ہوا میں یہ تیر کسی کو زخمی کرنے کے لیے نہیں چلایا تھا، صرف قاسمی صاحب کی تالیفِ قلب کے لیے تھا۔ مجھے ان حالات و واقعات سے واقفیت تو تھی، یہ معلوم نہ تھا کہ قاسمی صاحب کی دل گرفتگی میں پروین شاکر بھی پوری طرح شریک ہیں اور جو کچھ ''جسارت'' کے ادبی صفحے پر ہو رہا ہے اُس سے پوری طرح آگاہ بھی ہیں۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ پروین شاکر کا انٹرویو کیا جائے۔ حالاں کہ مَیں زیادہ تر بزرگ ادیبوں کے انٹرویوز کیا کرتا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھ پوری، پروفیسر احمد علی، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، سلیم احمد، آلِ احمد سرور وغیرہ۔ نئے ادیبوں کی طرف متوجہ ہونے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ پروین شاکر کے انٹرویو کا اچانک خیال کیوں اور کیسے آیا نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال، میں نے اُنھیں فون کھڑکایا۔ اُنھوں نے کال ریسیو کر کے پہلے حال احوال پوچھا۔ لیکن جیسے ہی میں نے حرفِ مُدّعا بیان کیا، اُن کے لہجے میں سختی آ گئی۔ بولیں:

''جسارت'' اخبار کے لیے تو میں ہرگز انٹرویو نہیں دے سکتی۔ اس میں جو کچھ عمّو جان (قاسمی صاحب) کے بارے میں چھپتا رہا ہے، اُس کے بعد آپ کیسے توقع رکھتے ہیں کہ میں اس

اخبار کے لیے انٹرویو دینے پر آمادہ ہو جاؤں گی؟‘‘

میں چاہتا تو اُنھیں قائل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ یہ کہہ سکتا تھا کہ خامہ بگوش کے کالم کی وجہ سے پورے ادبی صفحے سے بے زاری کیوں؟ اور اگر ایسی ہی بے زاری ہے تو آپ اس کا اظہار کر سکتی ہیں۔ میں انٹرویو میں آپ کے خیالات پوری دیانت داری سے شائع کر دوں گا۔ لیکن میں نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ جیسی آپ کی مرضی۔

پروین کا تبادلہ اسلام آباد میں کسی اچھی پوسٹ پر ہو گیا۔ وہ کراچی کو خیر باد کہہ گئیں۔ اُن کا بیاہ پیشۂ طب سے وابستہ ایک ڈاکٹر سے ہوا تھا، سُننے میں آیا تھا کہ میاں اچھی طبیعت کے ہیں لیکن بیگم کی شاعرانہ سرگرمیوں اور میل جول سے خوش نہیں ہیں۔ ایک بیٹا بھی تولد ہو چکا تھا۔ ازدواجی زندگی پروین کی اُلجھنوں اور تلخیوں کا شکار رہی۔ اُن کے سامنے اپنا شاندار ’’کیریر‘‘ تھا۔ کیریر کی دوڑ دُنیا میں کامیابی کی دوڑ ہوتی ہے جس میں دوڑتے ہوئے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ پیچھے کیا کچھ چھوٹا جاتا ہے، والدین، گھربار، دوست احباب، یادیں، بس دوڑتے دوڑتے آگے اور آگے اور آگے۔

ایک دن ٹیلی وژن کے آگے بیٹھا خبرنامے کا پروگرام دیکھ رہا تھا کہ نیوز کاسٹر نے گمبھیر لہجے میں ملک کی ممتاز شاعرہ پروین شاکر کی ٹریفک حادثے میں ہلاکت کی ناقابلِ یقین اطلاع دی۔ اسکرین پر اُن کی تباہ حال کار کی تصویر بھی دکھائی گئی۔ میں سنّاٹے میں رہ گیا۔

جس دوڑ میں پروین شریک تھیں، بھلا اُس میں کوئی اِتنا آگے بھی نکل سکتا ہے؟ اس کے سوا سوچنے اور محسوس کرنے کے لیے میرے پاس رہ بھی کیا گیا تھا؟

(طاہر مسعود۔۔۔۔۔ کتابی سلسلہ ’’ادبِ عالیہ‘‘، مارچ 2017ء)

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

ضمیمہ جات

(پروین شاکر پر لکھی گئی کتابوں کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ)

عالیہ جلیل شاہ

تنہا چاند

عالیہ جلیل شاہ نے ایم۔اے اُردو کی ڈگری کے حصول کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور سے (1995-1997ء) پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد نیّر صمدانی صاحب کی زیرِ نگرانی تحقیقی مقالہ بعنوان ''پروین شاکر، فن اور شخصیت'' لکھا۔ یہ مقالہ بعد میں ''تنہا چاند'' کے نام سے کتابی صورت میں سامنے آیا اور یہ کتاب الوقار پبلی کیشنز لاہور نے 1997ء میں شائع کی۔

اپنے اِس تحقیقی مقالے میں عالیہ جلیل شاہ نے پروین شاکر کی ''داستانِ عشق'' بیان کی ہے۔عالیہ جلیل شاہ کا کہنا ہے کہ پروین شاکر کی اُستاد عرفانہ عزیز پروین شاکر کی محبت کے بارے میں اِس طرح بتاتی ہیں:

> ''وہ اُداس سی سردیوں کی شام بھی یاد آتی ہے جب پروین گوشۂ چشم میں اشک لیے گھر مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے کہا:
>
> ''کیا بات ہے؟''
>
> ''مس میں ایک جذباتی حادثے سے دوچار ہوں۔''
>
> ''تم اپنی توجّہ فی الحال تعلیم اور شعر و سخن پر رکھو۔''
>
> ''مس مجھے وہ خدا کا درجہ دیتا ہے۔''
>
> محبت ایک خوب صورت جذبہ ہے پروین، لیکن زُود رنج معاشرہ ایسی ''بغاوت'' کو پسند نہیں کرتا۔

اگر دل کی تہذیب کی حدود میں تم اس معصوم سی چاہت کی پرورش کر سکتی ہو تو میں تمھارے ساتھ ہوں، لیکن والدین اسے گوارا نہیں کریں گے۔تمھاری نسبت طے ہے۔

''میں یہ تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔'' اُس (پروین) نے کہا۔

اور پھر ''خوشبو'' وجود میں آ گئی، قریہ قریہ کُو بہ کُو پھیل گئی۔ میں (عرفانہ عزیز) نے اُس کے محبوب کو دیکھا تھا۔ ذہین اور بانکا تھا۔ بہت جوشیلا، چڑھتے دریا کی طرح، لہجہ وادیوں میں گونجتے آبشاروں کی طرح۔ پروین کی یہ پہلی محبت تھی۔ وہ سولہ برس کی تھی۔''(1)

عرفانہ عزیز کے اِس بیان پر عالیہ جلیل شاہ نے تبصرہ یوں کیا ہے:

''خوشبو میں رچی بسی تمام شاعری اسی ہرجائی محبوب کے نام ہے۔محبت کے اِس تجربے نے پروین شاکر کے مقدّر میں وحشت کو لکھ دیا۔اس کے ماتھے پر بے سرو سامانی لکھ دی۔محبت نے پروین شاکر کی آنکھیں کچھ اِس طرح بھگو دیں کہ پھر تمام عمر اُنھوں نے اِس دُنیا کو بھیگی ہوئی آنکھوں ہی سے دیکھا۔''(2)

پروین شاکر نے سولہ برس کی عمر یعنی 1968ء میں ایف۔اے کیا تھا۔اور ''خوشبو'' 1977ء شائع ہوئی۔جب پروین شاکر کی ڈاکٹر نصیر سے شادی بھی ہو چکی تھی۔

مصنّفہ نے سولہ سالہ پروین شاکر کے اس ''عشق'' کے تجربے کا ذکر کیا ہے اور ''خوشبو'' کی ساری شاعری کو اُسی ہرجائی محبوب کے نام کر دیا ہے، مگر نہ تو اُس ''محبوب'' کا کوئی تعارف کروایا اور نہ اُس کے ہرجائی پن کی کوئی تفصیل بیان کی ہے۔البتہ یہ ضرور لکھا ہے کہ:

''خوشبو'' میں موجود محبوب ایک ہرجائی محبوب ہے۔۔۔۔۔اور یہ ایسا ''ہرجائی'' محبوب ہے کہ جو اپنی غلطی پر کبھی بھی پشیمان نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔پروین شاکر کا حقیقی محبوب بھی ایک ہرجائی محبوب ہے۔''(3)

مصنّفہ کا خیال ہے کہ وہ اہم واقعات جنھوں نے پروین شاکر کو حسّاسیت کی اِنتہا تک پہنچایا اور جس نے رومانوی حقیقت کے حصار میں بند ہو کر حقائق کو منکشف کیا، نظر میں رکھنا ضروری

ہے۔ اِسی سے پروین شاکر کی تمام تر زندگی کی تفہیم ہو سکتی ہے۔ اِسی تفہیم کے لیے مصنفہ نے پروین شاکر کی ''داستانِ عشق'' بیان کی ہے۔ اِس حوالے سے وہ لکھتی ہے:

> ''پروین شاکر نے جس ''شخص'' سے محبت کی اُس کے بارے میں مختلف آراء ملتی ہیں۔ایک روایت یہ ہے کہ پروین شاکر کو جس سے محبت ہوئی وہ ایک سرکاری دفتر میں ملازمت کرتا تھا۔ پروین شاکر اپنی ذات کی تمام تر سچائیوں سمیت اُس کی محبت میں سنجیدہ تھی جب کہ لڑکے کا مزاج مختلف تھا۔ وہ اِس محبت میں سنجیدہ نہ تھا۔ اِس کے علاوہ دونوں فریقین کے درمیان خاندانی اور مذہبی فاصلے بھی تھے۔ کچھ عرصہ بعد لڑکے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، کیونکہ پروین شاکر کو اُس کے رویّے سے دلی دُکھ پہنچا تھا۔ وہ گہرے صدمے کا شکار ہو گئی تھیں۔ لہٰذا اِس محبت نے پشیمان ہو کر اور اپنی غلطی کا احساس کر کے پروین کا رشتہ مانگ لیا۔ مگر یہ خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ پروین شاکر کے والد نے مسلک کو بنیاد بنا کر رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ اِس طرح پروین شاکر ڈپریشن کا شکار ہو گئیں۔''(4)

مصنّفہ نے یہاں یہ اعتراف تو کیا ہے کہ جیسے بھی تھا آخر اُس ہرجائی محبوب کو اپنی غلطی کا احساس تو ہوا اور اُس نے پروین شاکر کا رِشتہ مانگ بھی لیا، مگر پروین شاکر کے والد نے مسلک کی بنیاد پر انکار کیا۔ اِس کے باوجود مصنّفہ کو محبوب اور اُس کے ہرجائی پن ہی سے شکایت ہے۔ مصنّفہ لکھتی ہیں:

> ''اس ہرجائی نے سی۔ایس۔پی افسر بن جانے کے بعد ایک معمولی گھرانے کی لڑکی کو اپنانا گوارا نہ کیا۔''(5)

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہرجائی محبوب نے ٹھکرایا یا باپ نے انکار کیا اور اِس بات میں تھوڑا سا تضاد یہ بھی ہے کہ مصنّفہ نے پہلے تو یہ لکھا ہے کہ وہ شخص ایک سرکاری دفتر میں ملازمت کرتا تھا۔ یہ قطعاً نہیں بتایا کہ اُس کی ملازمت معمولی نہیں تھی بلکہ وہ ایک اعلیٰ افسر تھا۔ دوسرا اُس نے جیسا بھی ہے رشتہ طلب کیا، پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے معمولی گھر کی لڑکی کو اپنانا گوارا نہ کیا۔ مصنّفہ نے بات یہیں ختم نہیں کی بلکہ پروین شاکر کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کو بھی اسی

جذباتی کیفیت کا سبب قرار دیا ہے۔ مصنفّہ لکھتی ہیں:

''پروین شاکر کا مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا اور اسے نمایاں حیثیت میں پاس کرنا بھی اِسی جذباتی حقیقت کو لیے ہوئے ہے کہ پروین شاکر اپنے آپ کو معاشی و معاشرتی لحاظ سے اپنے محبوب کے برابر لانا چاہتی تھی اور یہ بتانا چاہتی تھی کہ عہدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جس عہدے کی خاطر ''خوشبو'' کی محبت نے ''خوشبو'' کو چھوڑا تھا وہی عہدہ بلکہ اس سے اعلیٰ عہدہ ''خوشبو'' کی اِس شاعرہ نے بھی حاصل کرلیا۔''(6)

اِس حوالے سے احمد پراچہ صاحب کا بیان یہ ہے کہ:

''وہ لڑکا شادی کی طرف مائل نہیں ہو رہا تھا۔ اُس لڑکے کی آرزو اور اُمنگ بہتر کیریئر تھا۔۔۔۔۔ اور اُسے احساس تھا کہ ایسی شادی اُسے زندگی میں بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے معاون اور مددگار ثابت نہیں ہوگی۔''(7)

اِس اقتباس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لڑکا ابھی معمولی ملازم ہے اور بہتر کیریئر کی خواہش رکھتا ہے۔ یعنی ابھی اُس نے مقابلے کا امتحان پاس نہیں کیا۔ اور عالیہ جلیل شاہ کے خود اپنے بقول پروین شاکر نے مقابلے کا امتحان 1981ء میں پاس کیا۔ اُس وقت وہ ڈاکٹر نصیر کی اہلیہ تھیں اور بیٹے مراد کی ماں بھی بن چکی تھیں۔

اِن باتوں کو اگر مدِّ نظر رکھا جائے تو عالیہ جلیل شاہ کی بیان کردہ یہ کہانی کہ مقابلے میں بیٹھنے اور اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے کی کوشش اُس جذباتی حقیقت کے سبب ہے، خود بخود غلط ہو جاتی ہے۔ عالیہ جلیل شاہ کی یہ کتاب بنیادی طور پر اُن کا ایم۔ اے اُردو کا تحقیقی مقالہ ہے۔ محقق کا حق ہے کہ وہ جو باتیں لکھے اُن کی مکمل تحقیق بھی کرلے، کیونکہ لوگ تحقیقی مقالے کو سند مانتے ہیں۔ اِس لیے محض سُنی سُنائی بغیر کسی حوالے کے باتوں کا اندراج لوگوں میں غلط فہمی پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

عالیہ جلیل شاہ نے روایتوں کا سہارا لے کر پروین شاکر کی داستانِ محبت تو بیان کی ہے مگر اِس راز سے پردہ نہیں اُٹھایا کہ یہ ہرجائی محبوب تھا کون؟ سولہ برس کی عمر میں پروین شاکر جو

محبت کا تجربہ کرنا چاہتی تھی ۔کیا موصوف وہی محبوب تھے یا عشق کی کوئی نئی واردات تھی اور کوئی نیا محبوب تھا؟ اِسی طرح بغیر کسی حوالے کے عالیہ جلیل شاہ نے ڈاکٹر نصیر کو پروین شاکر کا خالہ زاد بھائی لکھا ہے ۔جب کہ عرفان جاوید ڈاکٹر نصیر علی کو پروین کی والدہ کی ماموں زاد بہن کا بیٹا کہتے ہیں اور یوں بیان کرتے ہیں:

> ''پروین کے لڑکپن کے سولھویں برس کے پہلے ناکام مجنونانہ عشق اور بعد ازاں ایک سچی محبت پر شادی سے گھر والوں کے انکار نے پروین کو نفسیاتی اضمحلال سے دو چار کر دیا۔''(8)

عرفان جاوید صاحب نے 16 برس والے تجرباتی عشق کو ناکام قرار دیا ہے ۔اس میں یہ بات راز ہی رہی کہ محبوب کون صاحب تھے؟ اور اِس مجنونانہ عشق کی ناکامی کے اسباب کیا تھے؟ دوسری محبت کو عرفان جاوید صاحب نے سچی محبت قرار دیا ہے، مگر گھر والوں کے انکار کے سبب اِس محبت میں بھی کامیابی نصیب نہیں ہوسکی ۔

پروین شاکر کی پے در پے ان محبتوں کا ذکر تو سب نے بڑی دل چسپی سے کیا ہے مگر کسی نے بھی اُن ''ہرجائی'' محبوبوں کو تلاش کرنے اور اُن کے نام پتہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی ۔

مگر ایک بات بڑی عیاں اور نمایاں ہوتی ہے کہ اُن کا تجرباتی عشق ہو یا سچی محبت، پروین شاکر نے ایک روایتی مشرقی عورت کی طرح والدین کے فیصلے کے آگے سر جھکایا ہے ۔ اور والدین کی خوشی اور عزت کو ترجیح دی ہے ۔اس رویّے کی تعریف کرنے کی بجائے ہم اُس کے عشق اور اُس کی روایتوں کی گنتی ہی میں کھو کے رہ گئے ہیں ۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حواشی

1۔ عالیہ جلیل شاہ، ''تنہا چاند''، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 1997ء، ص32-33

2۔ ایضاً ص33

3۔ ایضاً ص32

4۔ ایضاً ص32

5۔ ایضاً ص32

6۔ ایضاً ص32

7۔ احمد پراچہ، ''پروین شاکر احوال و آثار، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، 2003ء، ص33

8۔ عرفان جاوید، ''سرخاب''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2020ء، ص27

کاندھے پہ دھرے ساز

زاہد حسین بھٹی نے 1997ء میں ڈاکٹر اجمل نیازی کی زیرِ نگرانی ایم۔اے اُردو کے لیے تحقیقی مقالہ ''ثروت حسین شخصیت اور فن'' لکھا، جسے بعد میں ''کاندھے پہ دھرے ساز'' کے نام سے 1998ء میں کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اِس کتاب میں زاہد حسین بھٹی نے پروین شاکر اور ثروت حسین کے عشق کی داستان رقم کی ہے۔ زاہد حسین بھٹی لکھتے ہیں:

> ''ثروت حسین ایم۔اے اُردو کے پہلے سال میں تھے کہ اُن کے دل میں عشق کی چنگاری پھوٹی۔ شعبہ انگریزی کے آخری سال میں ایک لڑکی تھی، جسے ثروت حسین نے پہلی بار لائبریری کے باہر دیکھا۔ رومان پسند اور حُسن پرست ثروت حسین آن کی آن میں فریفتہ ہو گئے اور اُن کے دل میں اُس لڑکی سے تعلقات بڑھانے کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ وہ لڑکی ایک اُبھرتی ہوئی شاعرہ تھی اور پروین شاکر کے نام سے نہ صرف یونیورسٹی میں بلکہ یونیورسٹی کے باہر کے ادبی حلقوں میں بھی پہچانی جاتی تھی۔''(1)

یعنی یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب پروین شاکر صرف یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ باہر کے ادبی حلقوں میں بھی بطور شاعرہ اپنی پہچان بنا چکی تھی۔

ثروت حسین اور پروین شاکر کی پہلی ملاقات کا ذکر مصنّف نے ثروت حسین کے دوست ممتاز رفیق کے کہانی نما خاکہ کے حوالے سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جی۔آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟''
>
> اپنے نشۂ حُسن میں ڈوبی ہوئی ''نوین'' (پروین) نے تعجّب سے پوچھا۔
>
> (ایسا کم ہی ہوا تھا کہ اُس کے ڈیپارٹمنٹ کے باہر کسی لڑکے نے اُسے مخاطب کرنے کی کوشش کی ہو)
>
> جب وہ اپنے لانبے گھنے سیاہ چمکدار بالوں کو اپنے شانوں پر لہرائے، اس اندازِ دِلبری سے محوِخرام ہوتی کتنے ہی ارمان بھرے دل دھڑکتے رہ جاتے۔ لیکن کم ہی کوئی

اس کو روکنے یا بات کرنے کی جُرأت کر پاتا۔

''جی۔میں آپ ہی سے مخاطب ہوں''لڑکے نے دوٹوک لہجہ میں جواب دیا۔۔۔

۔۔۔۔۔۔دراصل آپ سے اپنی شعری تجربے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ نے اپنا نام ثروت حسین بتایا؟

۔۔۔۔۔۔آپ وہی ثروت حسین تو نہیں جن کی غزل تازہ ''فنون'' میں چھپی ہے؟''

''جی۔۔۔۔۔۔میری غزلیں اور نظمیں اکثر ادبی رسائل میں چھپتی رہتی ہیں۔''

''اوہ۔۔۔۔۔آپ تو بہت معروف شاعر ہیں۔''

مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری شاعری پر توجہ دی۔'' نوین باقاعدہ متأثر نظر آ رہی تھی۔

(ص32)

اِس اقتباس میں پروین کے حُسن کی جھلک تو مصنف نے دکھائی ہے اور یہ بھی کہ اُسے دیکھ کر ارمان بھرے دل دھڑکتے تھے لیکن یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ:

''کسی لڑکے کو اُس سے بات کرنے جرأت نہیں ہوتی تھی اور ثروت حسین سے بھی پروین اُسے ایک معروف شاعر سمجھ کر اُسے متأثر ہوئی۔مگر رومان پسند ثروت حسین تو آن کی آن میں اُس پر فریفتہ ہو چکے تھی۔ممتاز رفیق نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ ثروت حسین ایک نفسیاتی مریض تھے،اور ذہنی عدم توازن کا شکار تھے۔''(2)

ثروت حسین کے چھوٹے بھائی شوکت عابد اِس ملاقات کے بارے لکھتے ہیں:

شوکت: ''بھائی خیریت،کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے کیا؟ بہت خوش ہیں۔''

ثروت: ''خزانہ۔۔۔۔۔۔نہیں وہ خزانہ سے زیادہ قیمتی ہے۔''

شوکت: ''کون ہے وہ؟۔۔۔۔۔۔جلدی بتائیے۔۔۔۔۔۔۔اب تو مجھے بھی اشتیاق ہو گیا ہے۔''

ثروت: ''اُس کا نام پروین شاکر ہے۔میری آج ہی اُس سے ملاقات ہوئی۔''

ص(35)

اِس ملاقات کے بعد بقول شوکت عابد:

''دونوں شاعری لکھ کر ایک دوسرے کو دکھاتے تھے۔ثروت حسین نے پروین شاکر

پر بھی نظمیں لکھیں۔۔۔۔۔پروین شاکر نے بھی ثروت حسین پر غزلیں لکھیں۔" (30)

یہ سلسلہ چلتا رہا اور احمد حسین کے بقول:

"ثروت اُس کی غزلیں اور نظمیں صاف کرتا تھا۔۔۔۔وہ اِس میں خوش تھا کہ وہ اُس کی غزلیں اور نظمیں "فیئر" کر رہی ہے اور وہ اُس کے پاس بیٹھی ہے۔"(34)

اب اِس سے قطعاً یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ غزلیں، نظمیں صاف کرنے یا غزلیں نظمیں فیئر کرنے سے کیا مراد ہے؟ البتہ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ دونوں اب اکٹھے بیٹھ کر ایک دوسرے کی شاعری دیکھا کرتے تھے۔ مصنّف کے بقول ثروت کی زندگی کا یہ دَور بڑا جاذبِ نظر اور دل فریب تھا۔ ثروت پوری طرح پروین میں کھو چکے تھے۔ اِس عشق کے حوالے سے ثروت حسین کے دوست احباب یوں اِظہارِ خیال کرتے ہیں:

احمد جاوید بیان کرتے ہیں:

"ثروت حسین عاشق ہونے میں بڑی جلدی کرتے تھے۔ اُن کے اندر دراَصل عاشق نہیں تھا بلکہ اُن کے اندر خواہش تھی محبوبیت کی۔ اُن کا پروین شاکر سے جو بہت زور شور سے عشق چلا اُس میں چار چار دن سوتے نہیں تھے۔ بس اُن کو یہ "احساس" تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔"(31)

ثروت حسین نے کلاس فیلو اقبال فریدی بتاتے ہیں:

"خوش گمانی اور خوش توقعاتی اُن کے ذہن میں بہت زیادہ تھی۔ وہ اکثر کہتے:
"پروین کو مجھ سے عشق ہے۔"

ثروت حسین کے دوست نسیم سترکھی اُن کے عشق کے بارے میں کہتے ہیں:

"صنفِ نازک کو شاعر و ادیب بہت اُلجھا دیتے ہیں۔ میرا خیال یا میرا جہاں تک تجزیہ یا میں نے جہاں تک مشاہدہ کیا ہے کہ پروین شاکر سے وہ زیادہ محبت کرنے لگے تھے۔ پروین شاکر جو اُن سے سیکھتی تھی، جب اُنھوں نے دیکھا کہ وہ عروج حاصل کر رہی ہے تو میرے خیال میں اُن کے اندر ہی اندر "جیلسی" پیدا ہو گئی تھی۔"(ص33)

مصنّف نے اِس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''ثروت حسین کے کلاس فیلوز کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ یک طرفہ نہیں تھا بلکہ دونوں محبت کے معاملے میں یکساں جذبات رکھتے تھے۔ رسم و راہِ محبت بڑھی تو دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی غزلیں اور نظمیں دِکھانا شروع کیں۔'' (ص 30)

حالانکہ دیکھا جائے تو کلاس فیلوز کے بیان میں کہیں بھی دوطرفہ محبت کا ذکر نہیں ہے۔

احمد جاوید کا بیان ہے کہ:

''اُن کو یہ ''احساس'' تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔''

اقبال فریدی کہتے ہیں: ''وہ اکثر کہتے، پروین کو مجھ سے عشق ہے۔'' اور نسیم سترکھی نے بات ہی واضح کر دی ہے کہ پروین شاکر سے وہ زیادہ محبت کرنے لگے تھے۔''

اِن بیانات سے تو کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ ''دونوں محبت کے معاملے میں یکساں جذبات رکھتے تھے۔'' پروین شاکر کی جانب سے تو ''محبت'' کا کوئی معمولی سا اِشارہ بھی نہیں ملتا۔ ایک دوسرے کو غزلیں نظمیں دکھانے یا پھر ''پروین شاکر اُن سے سیکھتی تھی''، ممکن ہے کلام میں اصلاح لیتی ہو۔ حالانکہ ثروت اُس سے جونیئر تھے، اِس سے زیادہ تو کوئی بات نظر نہیں آتی۔ اگر کوئی شخص اپنی جانب ہی سے یہ اندازہ لگا لے اور غلط فہمی کا شکار ہو جائے اور دوستوں سے کہتا پھرے کہ ''پروین کو مجھ سے عشق ہے'' تو اِس کا کیا علاج ہے؟ اور پھر کیا کوئی شخص اپنی ''محبوبہ'' سے ''جیلس'' ہوتا ہے؟ سترکھی صاحب تو کہتے ہیں:

''جب اُنھوں نے دیکھا کہ وہ عروج حاصل کر رہی ہے تو میرے خیال میں اُن کے اندر ہی اندر ''جیلسی'' پیدا ہو گئی تھی۔''

اگر پروین شاکر اور اُس کی شاعری لوگوں میں زیادہ مقبول ہو رہی تھی اور لوگ ثروت حسین کو اُن کے شایانِ شان مقام نہیں دے رہے تھے، تو اس میں پروین شاکر کا قصور کیا ہے؟ کہ اُس کی کردار کُشی کی جائے۔ زاہد حسین بھٹی لکھتے ہیں:

''پروین شاکر ایک چالاک لڑکی تھی۔ وہ ثروت حسین کی احمقانہ سادگی سے فائدہ اُٹھا رہی تھی۔ ثروت کا لا اُبالی پن اور کمزوریاں اُس کے سامنے تھیں، چنانچہ جلد ہی اُس نے ثروت حسین سے پہلوتہی اختیار کرنا شروع کر دی۔'' (ص 34)

پروین شاکر نے ثروت حسین سے پہلوتہی کیوں اِختیار کرنا شروع کی۔ مصنّف نے اس کی وجوہات خود ہی تحریر کردی ہیں۔ کسی اور وضاحت کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ مصنّف نے ایک رعایت برتی ہے کہ پروین شاکر کو صرف ''ایک چالاک لڑکی'' ہی کہا ہے، احمد ہمیش کی طرح کردار کُشی نہیں کی اور تہمتیں نہیں لگائیں۔ مصنّف نے اپنے مندرجہ بالا بیان کے فوراً بعد احمد ہمیش کا بیان نقل کیا ہے۔ احمد ہمیش صاحب فرماتے ہیں:

> ''ثروت مجھ سے بڑے قریب تھے۔ اُن کا رومانس اُس زمانے میں پروین شاکر کے ساتھ چل رہا تھا۔ پروین شاکر میں گلیمر اور سیکس اپیل تھی۔ خوب صورت عورت تھی اور اس کا اُسے احساس تھا اور وہ اُن عورتوں میں سے تھی جو اپنی خوب صورتی سے فائدہ اُٹھانا جانتی ہیں۔ اُس میں شعر کہنے کی صلاحیت بھی موجود تھی اور جانتی تھی کہ مرد شاعروں سے کس طرح فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ ثروت سے دوپہر تک کا پارٹ ٹائم عشق کررہی تھی اور فل ٹائم معاشقہ صہبا اختر سے چل رہا تھا جو مشاعرہ بیٹ شاعر تھے۔ اُن (ثروت) سے پروین نے کچھ فائدہ اُٹھایا۔ پروین میں وقار اور عشق نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ مختلف لوگوں کو شہرت کے لیے بطور سیڑھی استعمال کررہی تھی۔'' (ص 34)

احمد ہمیش صاحب نے ایک چیز تو تسلیم کی کہ ''پروین میں عشق نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔'' اگر اُس میں عشق نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی تو کم از کم مصنّف کا یہ دعویٰ تو باطل ہوا کہ ''دونوں محبت کے معاملے میں یکساں جذبات رکھتے تھے۔'' دوسری بات احمد ہمیش صاحب نے یہ فرمائی ہے کہ خوب صورت عورت کے معاملے میں تمام مرد ایک ہی طرح کی ''احمق'' ہوتے ہیں اور خوب صورت عورت اُنھیں اپنے مطلب کے لیے ایک ہی طرح بطور سیڑھی استعمال کرسکتی ہے۔ اب یہاں کس کی تعریف کی جائے، عورت کی خوب صورتی اور چالاکی کی یا مرد کی ''حماقت'' کی۔ اِتنا کچھ بیان کرنے کے باوجود احمد ہمیش صاحب کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ مزید فرماتے ہیں:

> ''پروین شاکر ایک Cock Teaser خاتون تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کس سے کس طرح فائدہ لینا ہے۔ ثروت حسین میں ایک ''احمقانہ سادگی'' تھی۔ ثروت اُس کی غزلیں اور نظمیں صاف کرتا تھا۔ مزید یہ کہ وہ اُس کے ساتھ کاپیاں اور کتابیں ڈھونڈ کر چلتا تھا۔

ثروت بڑا اچھا اور جینئیس شاعر تھا۔ مگر وہ دنیا دار آدمی نہیں تھا۔ مختلف چالوں اور ہوشیاریوں کو نہیں سمجھتا تھا۔ کسی عورت کے مکر کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ پروین کی ''مکاری'' کو بھی نہیں سمجھ سکا۔ وہ اِس میں خوش تھا کہ وہ اُس کی غزلیں اور نظمیں فیئر کر رہی ہے اور وہ اس کے پاس بیٹھی ہے۔۔۔۔۔۔ پروین کو ثروت اور دوسرے لوگوں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ وہ اپنے نظریہ ضرورت کے تحت اب زیادہ اُونچا اُڑنے لگی تھی۔ اب اُس کا رومانس ایک بیوروکریٹ آفیسر اسد اشرف ملک سے چل رہا تھا۔ پھر پروین شاکر شہرت حاصل کرتی گئی۔ اُس نے احمد ندیم قاسمی کو ''عمو جان'' بنالیا۔ اُن کی وجہ سے اُس کو بہت فائدہ ہوا۔'' (ص 35)

مسئلہ صرف یہ نظر آ رہا ہے کہ پروین شاکر اُونچا اُڑنے لگی تھی اور زیادہ مشہور ہوتی جا رہی تھی، اور اُن لوگوں کو پروین شاکر کی شہرت ہضم نہیں ہو رہی تھی اور یہ پروین شاکر کا اِتنا بڑا ''جرم'' تھا کہ اُس کے انتقال کے بعد بھی احمد ہمیش جیسے لوگ اُسے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اُسے مکار عورت کہہ کر اپنے جذبہ انتقام کا اِظہار کر رہے ہیں۔ احمد ہمیش صاحب نے جو کچھ اِرشاد فرمایا ہے، اس میں کسی انداز سے بھی پروین شاکر کی مکاری ظاہر نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے ایک وقت میں پروین شاکر نے کچھ غزلیں نظمیں ثروت حسین کو دِکھائی ہوں اور ان پر اصلاح بھی لی ہو اور بعد میں پروین شاکر کا احمد ندیم قاسمی صاحب سے رابطہ ہو گیا اور اُن کو اپنا کلام دکھلانے لگی ہو تو اِس میں کون سا ایسا جرم ہے جو اُسے مکاری کے طعنے دیے جائیں۔ احمد ہمیش صاحب کو شاید یہ بھی علم نہیں کہ پروین شاکر سے رابطہ خود احمد ندیم قاسمی صاحب نے کیا تھا جس کا اعتراف احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنی کتاب ''میرے ہم قدم'' میں کیا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ 1971ء میں (جب پروین ابھی یونیورسٹی کی طالبہ تھی) عبیداللہ علیم صاحب نے قاسمی صاحب کو پروین کی کچھ غزلیں اور نظمیں ''فنون'' میں اشاعت کے لیے ارسال کی تھیں، جو اُنھیں بہت پسند آئیں اور اُنھوں نے خط لکھ کر پروین کی شاعری کی داد دی اور یہیں سے اُن کے درمیان مراسلت کا آغاز ہوا۔ مراسلت کا یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا اور بقول قاسمی صاحب:

’’تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے درمیان عمّو اور بیٹی کا وہ لازوال رشتہ قائم ہوگیا جو آخرتک قائم رہا۔‘‘(3)

اب اس ’’عمّو اور بیٹی‘‘ کے رشتے پر بھی احمد ہمیش کو اعتراض ہے۔ وہ کہتے ہیں ’’اُن کی وجہ سے اُس کو بہت فائدہ ہوا۔‘‘ ’’بیٹی‘‘ نے اگر اپنے ’’عمّو جان‘‘ سے فائدہ اُٹھایا ہے تو کون سا گناہ کیا ہے؟ رہی پروین شاکر کی ثروت حسین سے بے اعتنائی کی بات، تو ثروت حسین کے دوستوں کے بیانات میں بھی کوئی ایسا اِشارہ نہیں ملتا کہ پروین شاکر نے کبھی اظہارِ محبت کیا ہو یا کوئی پیمانِ وفا باندھا ہو۔ اگر ثروت حسین صاحب خود ہی کسی خوش گمانی اور خوش فہمی میں مبتلا ہو کر یہ اعلان فرماتے جائیں کہ ’’پروین کو مجھ سے عشق ہے‘‘ تو اِس میں پروین کو کیسے موردِ الزام ٹھہرایا جائے اور کس طرح اُس پر تہمت لگائی جائے اور اُس کا دامن داغ دار کیا جائے؟

مصنّف لکھتے ہیں:

’’پروین شاکر سے عشق میں ناکامی نے جہاں ثروت حسین کو ایک بڑے صدمے سے دوچار کیا وہاں اُن کی شخصیت میں بھی تبدیلی ہوئی۔ دوستوں کے بقول اب وہ اِتنے بدل گئے کہ ماضی کا ثروت حسین کہیں گم ہو کر رہ گیا۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر اصغر مہدی کو بڑا ترس آیا۔‘‘(ص36)

احمد ہمیش کی طرح اصغر مہدی صاحب اور دوسرے احباب نے بھی پروین شاکر کو بدنام کرنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ زاہد حسین بھٹی صاحب کہتے ہیں کہ مجھے احمد جاوید صاحب نے بتایا:

’’اصغر مہدی اُن دِنوں ریڈیو میں پروڈیوسر تھے۔ غیر معمولی طور پر خوب صورت۔ اُنھیں ثروت پر ترس آتا تھا۔ ثروت کی حالت غیر دیکھ کر نہ رہ سکے اور اُنھیں کچھ قابل اعتراض تصویریں دیں اور سمجھایا کہ یہ افلاطونی عشق چھوڑو۔ اصغر مہدی کے پاس پروین شاکر سے متعلق اِتنا مواد تھا کہ اگر وہ اُس کو بلیک میل کرتے تو وہ ’’خودکُشی‘‘ کر جاتی۔‘‘ (ص37)

ثروت حسین کے دوست احمد جاوید صاحب نے مصنّف کو یہ واقعہ اپنے انٹرویو میں مؤرخہ 19 اگست، 1997ء کو بیان فرمایا۔ تعجّب ہے کہ غیر معمولی طور پر خوب صورت آدمی اصغر مہدی صاحب

نے اس ''مواد'' کا تذکرہ صرف احمد جاوید صاحب ہی سے کیوں کیا؟ اور پھر احمد جاوید صاحب نے اِس کا ذکر اُس وقت کیوں کیا جب پروین شاکر کو انتقال کیے (26 دسمبر 1994ء) بھی ایک مدت گزر چکی تھی۔ اب اُس کے انتقال کے بعد جب خودکُشی کا وقت گزر چکا تھا، کس کو بلیک میل کرنا مقصود ہے؟ یہ ''تصویریں'' دیکھ کر کیا ردِعمل ہوا؟ کیا اُنھوں نے افلاطونی عشق سے توبہ کرلی یا اصغر مہدی کا مونہہ نوچ لیا کہ تم کون ہوتے ہو میرے ''محبوب'' کو بدنام کرنے والے؟ کاش مصنّف نے اِس بارے میں بھی کوئی تحقیق فرمائی ہوتی؟ مگر لگتا ہے کہ مصنّف خود دوسرے احباب کے ساتھ مل کر پروین شاکر کو بدنام کرنے کی مہم میں شامل ہے۔ اِسی لیے تو وہ احمد ہمیش کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''دو چیزیں ثروت حسین کو خودکُشی کی طرف لے گئیں

1۔ پروین شاکر کی بے وفائی

2۔ فن کی ناقدری کا دُکھ (ص 57)

پہلے فن کی ناقدری کا جو دُکھ ہے، اُس کا جائزہ لیتے ہیں:

مصنّف خود لکھتے ہیں ''اُنھیں اپنے فن کی ناقدری کا دُکھ تھا۔ اُن سے بہت جونیئر شاعر جو فنّی حوالوں سے اُن کے عشرِعشیر بھی نہیں تھے،، بہت آگے نکل گئے۔ ثروت حسین کی بیوی ساجدہ بیگم کا بیان ہے کہ:

''جب کوئی جونیئر شاعر میڈیا کے تعاون سے زیادہ مشہور ہو جاتا تو فقط اِتنا کہتے کہ ''دیکھو یہ بھی مشہور ہوگیا۔'' (ص 59)

مصنّف کہتے ہیں کہ ثروت کے ساتھ یہ بڑی زیادتی تھی کہ اُن کا مجموعہ سامنے آیا تو بھی اُن پر بہت کم لکھا گیا۔ جب اُنھوں نے خودکُشی کی پہلی ناکام کوشش کی اور اس پر اُن کے دونوں پاؤں کٹ گئے تو اسپتال میں طاہر مسعود اُن کی عیادت کو آئے تو ثروت اُن کو دیکھتے ہی تیزی سے بولے:

''طاہر اب تو تم مجھ پر لکھو گے۔'' (ص 60)

ظاہر ہے ایک آدمی چاہے جتنے بھی بڑے حوصلے کا مالک کیوں نہ ہو آخر کب تک صبر کر

سکتا ہے۔ثروت حسین کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا اور بقول ممتاز رفیق:

''کتاب کی عدم پذیرائی کا دُکھ اُسے دیمک کی طرح چاٹنے لگا تھا۔''(4)

ثروت حسین کے بھائی شوکت عابد تو خودکُشی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔وہ اسے حادثہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ثروت حسین کو ہماری مجموعی طور پر شعروادب میں پھیلی ہوئی بدذوقی نے مارا ہے۔
یہ جو بولان میل گزر رہی تھی ، اُس نے ثروت حسین کو کچھ نہیں کیا بلکہ یہ
جو Midiocrity کی ٹرین گزر رہی تھی،اُس نے ثروت کو کچل دیا اور یہ بہت زیادہ
دُکھ کی بات ہے۔''(ص55)

اِن بیانات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اُس کی ''خودکُشی''،میں فن کی ناقدری کے دُکھ کا زیادہ حصّہ ہے۔رہی خودکُشی کی دوسری وجہ ''پروین شاکر کی بے وفائی'' تو اُس کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔پروین شاکر اور ثروت حسین کا تعلق،جامعہ کراچی میں 1971-1972ء میں رہا،جب وہ وہاں زیرِتعلیم رہے۔اس کے بعد اُن کے درمیان کسی رابطے کا مصنّف نے ذکر نہیں کیا۔ثروت حسین نے خودکُشی (یا حادثاتی موت) 9 ستمبر 1996ء کو کی۔گویا پروین شاکر سے جدائی یا اُس کی بے وفائی کے تقریباً 24 برس بعد۔اُن کی زندگی کے بارے زاہد حسین بھٹی صاحب لکھتے ہیں'' شادی سے پہلے اور شادی کے بعد اُن کی گھریلو زندگی مطمئن گزری۔کوئی پریشانی اُن کو گھر کی طرف سے کبھی نہیں ہوئی۔اپنی بیگم کا ذکر عموماً مطمئن انداز میں کیا کرتے تھے۔اُنھوں نے کبھی اپنی بیگم کی شکایت نہیں کی بلکہ بہت ناز کیا کرتے تھے کیونکہ اُن کی بیگم نے بیماری کے دِنوں میں اُن کی بہت زیاد تیمارداری کی تھی۔ثروت حسین کو بچوں سے پیار تھا۔وہ محبت کرنے والے انسان تھے۔والدین،بہن بھائی اور دوستوں سے اُن کے گہرے تعلق و ربط تھے۔بظاہر وہ بڑے مطمئن تھے۔1993ء می ایک حادثے میں وہ اپنے دونوں پاؤں سے ضرور محروم ہوئے تھے،لیکن لوگوں کی غیر معمولی پذیرائی نے اُن میں ایک نئی رُوح پھونک دی تھی اور زندگی دوبارہ معمول پر آ گئی تھی۔اِس حادثے کے بعد ثروت حسین کو نئی زندگی گزارنے کے رموز اور ڈھنگ آ گئے تھے۔اور اب وہ

زیادہ پُر اعتماد اور مطمئن نظر آتے تھے اور پھر اچانک 9 ستمبر 1996ء کو خودکُشی کر لی۔ گو شوکت عابد سمیت تمام اہلِ خانہ اسے حادثہ قرار دیتے ہیں مگر دوست احباب اسے خودکُشی ثابت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور مصنّف کا بھی خیال ہے کہ اگر ثروت حسین کی لائف ہسٹری کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا جائے تو یہ واقعی خودکُشی تھی۔

اگر اسے خودکُشی ہی مان لیا جائے تو اس کی ذمہ داری پروین شاکر یا اُس کی بے وفائی پر کیسے ڈالی جا سکتی ہے؟ یہ تب ہوتا اگر وہ 1972۔73ء میں ایسا قدم اُٹھاتے جب احباب کے مطابق پروین شاکر نے بے اعتنائی برتی تھی، جس کا اُس کی شخصیت پر اثر بھی بہت ہوا تھا، یا پھر وہ 1976ء میں کرتے جب پروین شاکر کی شادی ہوئی تھی۔ خودکُشی کی بجائے اُنھوں نے خود بھی اُس سال شادی رچائی۔ یا پھر اُس وقت خودکُشی کرتے جب پروین کا گھر اُجڑا تھا اور اُسے طلاق ہوئی تھی۔ پھر کہا جا سکتا تھا کہ وہ محبوب کے دُکھ کو برداشت نہ کر سکے اور خودکُشی کر لی۔ یا پھر پروین شاکر کی حادثاتی موت کے وقت کرتے تو مان لیتے وہ محبوب کی دُنیا سے رُخصتی کے غم کو برداشت نہ کر سکے۔ یہ تمام مواقع تو خیریت سے گزر گئے اور ان مواقع پر اُس کا ردِّ عمل کیا تھا یا اُس کے کیا تاثرات تھے، مصنف نے کہیں بھی اِس کا ذکر نہیں کیا۔ پھر اچانک 1996ء میں ثروت حسین نے خودکُشی کر لی اور چند احباب نے 1997ء میں واویلا شروع کر دیا کہ یہ پروین شاکر کی بے وفائی کا نتیجہ ہے۔ اِس دھوکے کو کیسے سچ مان لیا جائے۔ ثروت حسین کے دوست احمد جاوید نے بھی اِس دعوے کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’پروین شاکر کی بے وفائی کا اثر ثروت پر بالکل نہیں تھا۔ جتنا وقت وہ اُن کے ساتھ رہی، اُسے ہی بہت تشکّر کے ساتھ قبول کیا۔‘‘ (ص199-198)

مگر مصنّف کو پھر بھی اصرار ہے کہ احمد ہمیش کی اِس رائے کو تسلیم کیا جائے کہ ثروت حسین کی خودکُشی کے محرّکات میں سے ایک پروین شاکر کی بے وفائی بھی تھا۔ مصنّف لکھتے ہیں:

> ’’ثروت حسین نے پروین شاکر کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اُن کے جذبات خالص تھے لیکن بقول ثروت حسین کے دوستوں کے، پروین شاکر ’’ہرجائی عورت‘‘ تھی۔ وہ مردوں کو

بطور سیڑھی استعمال کرتی رہی۔ بدقسمتی سے ثروت حسین نے اُس کے لیے پہلی سیڑھی کا کام کیا۔ ثروت کے لیے اِتنی خوش گمانی ہی کافی تھی کہ پروین اُس سے محبت کرتی ہے، جبکہ پروین، ثروت، صہبا اختر، اسد اشرف ملک اور اصغر مہدی سے عشق کا ڈھونگ رچاتی رہی اور اُس نے ثروت حسین کو بُری طرح نظر انداز کر دیا اور جب پروین نے اُن سے بے اعتنائی کی تو وہ بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔'' (ص 60)

اور یہی بے راہ روی آخر کار اُس کی خودکُشی کا سبب بنی۔ اس بے راہ روی کا عرصہ 24 سال پر محیط ہے، جس دوران اُنھوں نے کالج میں ملازمت بھی کی، شادی بھی رچائی، بچے بھی پیدا کیے اور مطمئن زندگی بھی گزارتے رہے اور پھر 24 برس بعد اچانک ایک دن یاد آیا کہ میرے ساتھ تو ایک عورت نے بے وفائی کی تھی۔ مجھے تو خودکُشی کرنا چاہیے تھی، اور خودکُشی کر لی۔ افسوس ہے کہ مصنّف نے تحقیق کا حق پورے طور پر ادا نہیں کیا۔ ثروت حسین سے لے کر اصغر مہدی تک، پروین شاکر پر عشق کا ڈھونگ رچانے کی تہمت لگائی۔ احباب سے سُنی سُنائی باتوں پر اعتبار کیا ہے۔ کوئی مدلّل اور ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیے اور احباب کے بیان میں بھی کوئی ایک اشارہ بھی فراہم نہیں کر سکے جس سے پروین شاکر کی محبت کا اِظہار ہوتا ہو۔ مصنّف بھی سادگی میں پروین شاکر کو بدنام کرنے کی سازش میں شریک ہوئے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب جو اِس ''تحقیقی مقالے'' کے نگران تھے اُنھوں نے بھی اِس جانب توجہ نہیں فرمائی اور اِس ساری سُنی سُنائی ''داستانِ محبت'' کے کوئی ثبوت محقق سے طلب نہیں کیے اور یوں چشم پوشی کر کے، ثروت حسین کی خوش گمانی ہی کو عشقیہ کہانی سمجھ کر، محقق کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد صاحب نے کتاب کا دیباچہ لکھتے ہوئے اس کا نوٹس ضرور لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ثروت حسین اور پروین شاکر کے عشق کے بارے میں جو معلومات پیش کی گئی ہیں ان میں ایک محقق کی بے رحمانہ اصول پسندی صاف جھلکتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ ثروت حسین کے دوستوں نے بھی اپنے وقت کی ایک نام ور شاعرہ کی نجی زندگی

کے راز کھولنے میں اِتنی صاف گوئی سے کام لیا ہے کہ ثروت حسین کی بعض بشری
کمزوریاں بھی منظرِ عام پر آ گئی ہیں۔''(ص10)

یعنی محقق نے اگر بے رحمانہ اصول پسندی کا مظاہرہ کیا ہے تو ثروت حسین کے نادان دوست بھی پروین شاکر کے راز کھولنے کے شوق میں ثروت حسین ہی کی بشری کمزوریوں کو منظرِ عام پر لائے ہیں۔ پروین شاکر اور ثروت حسین دونوں اِس جہانِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ اخلاقیات اور مشرقی روایات کا تقاضا تھا کہ ان کی بشری کمزوریوں کو منظرِ عام پر نہ لایا جاتا۔ پردہ پوشی کی جاتی۔ اگر ان دونوں میں کبھی مراسم رہے بھی تھے (وہ بھی اِس تحقیق سے یہی ثابت ہے کہ یک طرفہ تھے) تو ان کا ذکر سرسری سا ہوتا تو بہتر تھا۔ دونوں مرحومین کو بدنام کرنے اور خاص طور پر پروین شاکر کا دامن داغ دار کرنے کی اِتنی بھرپور کوشش نہ کی جاتی۔ دوست احباب کے بیانات سے یہی نتائج اخذ کرلینا کافی تھا کہ جامعہ کراچی میں تعلیم کے دوران اُن کے دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ خلق خدا تو کہنے کو افسانہ مانگتی ہے اور محقق نے سادگی میں مشرقی روایات کا مدلّل اور ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیے اور احباب کے بیان میں بھی کوئی ایک اشارہ بھی فراہم نہیں کر سکے جس سے پروین شاکر کی محبت کا اِظہار ہوتا ہو۔ مصنّف بھی سادگی میں پروین شاکر کو بدنام کرنے کی سازش میں شریک ہوئے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب جو اِس ''تحقیقی مقالے'' کے نگران تھے اُنھوں نے بھی اِس جانب توجہ نہیں فرمائی اور اِس ساری سُنی سُنائی ''داستانِ محبت'' کے کوئی ثبوت محقق سے طلب نہیں کیے اور یوں چشم پوشی کر کے، ثروت حسین کی خوش گمانی ہی کو عشقیہ کہانی سمجھ کر، محقق کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد صاحب نے کتاب کا دیباچہ لکھتے ہوئے اس کا نوٹس ضرور لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ثروت حسین اور پروین شاکر کے عشق کے بارے میں جو معلومات پیش کی گئی
ہیں ان میں ایک محقق کی بے رحمانہ اصول پسندی صاف جھلکتی ہے۔ عجیب بات ہے
کہ ثروت حسین کے دوستوں نے بھی اپنے وقت کی ایک نام ور شاعرہ کی نجی زندگی

کے راز کھولنے میں اِتنی صاف گوئی سے کام لیا ہے کہ ثروت حسین کی بعض بشری کمزوریاں بھی منظرِ عام پر آ گئی ہیں۔" (ص10)

یعنی محقق نے اگر بے رحمانہ اصول پسندی کا مظاہرہ کیا ہے تو ثروت حسین کے نادان دوست بھی پروین شاکر کے راز کھولنے کے شوق میں ثروت حسین ہی کی بشری کمزوریوں کو منظرِ عام پر لائے ہیں۔ پروین شاکر اور ثروت حسین دونوں اِس جہانِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ اخلاقیات اور مشرقی روایات کا تقاضا تھا کہ ان کی بشری کمزوریوں کو منظرِ عام پر نہ لایا جاتا۔ پردہ پوشی کی جاتی۔ اگر ان دونوں میں کبھی مراسم رہے بھی تھے (وہ بھی اِس تحقیق سے یہی ثابت ہے کہ یک طرفہ تھے) تو ان کا ذکر سرسری سا ہوتا تو بہتر تھا۔ دونوں مرحومین کو بدنام کرنے اور خاص طور پر پروین شاکر کا دامن داغ دار کرنے کی اِتنی بھرپور کوشش نہ کی جاتی۔ دوست احباب کے بیانات سے یہی نتائج اخذ کر لینا کافی تھا کہ جامعہ کراچی میں تعلیم کے دوران اُن کے دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ خلق خدا تو کہنے کو افسانہ مانگتی ہے اور محقق نے سادگی میں مشرقی روایات کا خیال نہیں کیا اور اِس افسانے میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی یہ کوشش کوئی اِتنی قابلِ تعریف نہیں ہے۔

❁❁❁❁❁

حواشی

1۔ زاہد حسین بھٹی ’’کاندھے پہ دھرے ساز‘‘، لاہور، غالب نما، 1998ء، ص29

نوٹ: ’’کاندھے پہ دھرے ساز‘‘ میں سے جتنے اقتباس لیے گئے ہیں، اُن کا صفحہ نمبر متن میں وہیں درج کر دیا گیا ہے۔‘‘

2۔ ممتاز رفیق، خاکہ ثروت حسین بعنوان ’ستارہ ساز‘، مشمولہ ’اُردو کے شاہکار خاکے، جلد اوّل مرتّب خلیل احمد، لاہور، فکشن ہاؤس، 2017ء، ص391

3۔ احمد ندیم قاسمی ’’میرے ہم قدم‘ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2007ء، ص119

4۔ ممتاز رفیق ’’اُردو کے شاہکار خاکے‘‘ جلد اول، ص393

احمد پراچہ

پروین شاکر، احوال و آثار

ابھی زاہد حسین بھٹی صاحب کی اُٹھائی ہوئی گرد پوری طرح بیٹھی بھی نہ تھی کہ احمد پراچہ صاحب کی کتاب ''پروین شاکر احوال و آثار'' مطبوعہ 2003ء منظرِ عام پر آ گئی۔ اور یہ کتاب مصنف کے اپنے بقول:

''اپنی بساط کے مطابق چار سال کی جدوجہد، تحقیق اور عرق ریزی کے بعد اس کتاب پر کام مکمل کیا ہے۔۔۔۔۔ زیرِ نظر کتاب میرا ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ اِس موضوع کا انتخاب ذاتی پسند اور ذوق و شوق کے مطابق میں نے خود ہی کیا ہے۔

یہ کتاب لکھنے کا مقصد اُنھوں نے یہ بتایا ہے کہ:

''میری کوشش یہ رہی ہے کہ یہ کتاب ''پروین شاکر احوال و آثار'' شاعرہ مرحومہ کی یادوں کو جگمگانے اور تازہ کرنے کا ایک پیش نامہ ثابت ہو۔'' (ص4)

اب پتا نہیں یہ کتاب مرحومہ کی یادوں کو جگمگانے اور تازہ کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی یا نہیں، البتہ عرق ریزی کی صورتِ حال یہ ہے کہ صفحہ نمبر 23 پر لکھتے ہیں:

''1970ء میں پروین نے سرسیّد کالج برائے خواتین کراچی سے INTER کیا۔

اور کتاب کے ضمیمہ میں صفحہ نمبر 276 پر پروین شاکر کے حالات و کوائف درج کرتے لکھا ہے۔ ایف۔ اے 1968ء اور جامعہ کراچی میں ان کا دورانیہ بھی ایک سال ہی کا بتایا ہے۔''

اُنھوں نے لکھا ہے:

''بی۔ اے آنرز انگریزی، سرسید گرلز کالج، کراچی، 1971ء۔

''ایم اے انگریزی، ادبیات جامع کراچی، 1972ء (ص276)

ممکن ہے بی۔ اے آنرز کے بعد ایم۔ اے ایک ہی سال کا ہو۔ مگر ہم نے ''گرلز کالج

کا نام کہیں نہیں سُنا بلکہ وومن کالج یا کالج برائے خواتین ہی سُن رکھا ہے۔اور نہ کبھی ہم نے ’’جامعہ‘‘ کے لیے ’’جامع‘‘ کا لفظ کبھی پڑھا ہے۔ہوسکتا ہے یہ ہماری کم علمی ہو،اِسے احمد پراچہ صاحب یا قارئین بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔

’’عرق ریزی‘‘ کی ایک اور مثال بھی قابلِ توجہ ہے۔’’تعلیمی سفر اور اعزازات‘‘ صفحہ نمبر 17 سے صفحہ نمبر 56 تک پھیلا ہوا ہے اور اِسی باب میں پروین شاکر کے تعلیمی سفر اور ’’اعزازات‘‘ کے ساتھ ساتھ اُس کا عشق، شادی، اولاد، ملازمت اور طلاق کے سب واقعات جمع کر دیے گئے ہیں، اور مصنّف نے اپنے متن میں مختلف حوالے بھی دیے ہیں، جن پر 1 سے لے کر 17 تک نمبر درج کیے گئے ہیں۔مگر باب کے آخر میں صفحہ نمبر 57 پر حوالہ جات ہیں۔دو اخباروں اور تین کُتب کا نام درج کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ 6 سے 17 تک جو نمبر درج ہیں اُن کے حوالے کہاں ہیں؟ پوری عرق ریزی کے باوجود وہ ڈھونڈنے سے آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔

اور جو 5 حوالے موجود ہیں اُن میں بھی کسی کتاب کے صفحہ نمبر کا اندراج نہیں ہے کہ قاری بیان شُدہ واقعہ کی تصدیق کر سکے۔اِس جگمگاتی یادوں پر مشتمل کتاب میں راقم کے لیے دلچسپی کا موضوع صرف ’’وارداتِ عشق‘‘ ہے۔اِس عُنوان کے تحت مصنّف نے ’’پروین شاکر‘‘ کی تین عدد عشق کی وارداتوں کا ذکر کیا۔بقول مصنّف:

> ’’پروین شاکر نے پہلا عشق اُس وقت کیا جب وہ ابھی 16 برس کی تھی اور پروین کے اِس ’’عشق‘‘ کا علم صرف اُس کی اُستاد عرفانہ عزیز کو تھا۔ 16 برس کی عمر (یعنی 1968ء) میں پروین نے ابھی انٹر کا امتحان پاس کیا تھا۔وہ ابھی یونیورسٹی نہیں پہنچی تھی۔یعنی ابھی پروین کی ثروت حسین سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔‘‘(1)
>
> عرفانہ عزیز کے سمجھانے کے باوجود کہ ہمارا زُود رنج معاشرہ ایسی ’’بغاوت‘‘ کو پسند نہیں کرتا۔پروین شاکر کا یہی اصرار تھا کہ:
>
> ’’مس! وہ مجھے دیوتا کا درجہ دیتا ہے۔۔۔۔۔میں یہ تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔‘‘
>
> (ص 31, 32)

مگر اِس ’’تجربہ‘‘ کا انجام کیا ہوا؟ نہ تو عرفانہ عزیز صاحبہ نے اِس بارے کوئی وضاحت

فرمائی ہے اور نہ مصنّف کی ''عرق ریزی'' کسی کام آئی ہے ۔ اِس وارداتِ عشق کو یہیں ادھورا اور تشنہ چھوڑ کر مصنّف پروین شاکر کی دوسرے عشق کی واردات تک پہنچ گیا ہے ۔ اِس ''واردات'' سے پہلے مصنّف نے ایک مفروضہ قائم کیا ہے جسے قدرتی امر کا نام دیا ہے ۔ احمد پراچہ صاحب لکھتے ہیں:

''رومانوی شاعری کے لیے دل شکستہ اور محبت کی لرزش بہت ''ضروری'' ہے ۔ پروین نے بھی محبت کی ۔ طالب علمی کے زمانے میں یہ ''فطری امر'' تھا کہ سینئر جماعت کے خوش رُو، خوبرو اور مردانہ وجاہت کے حامل ''طلبا'' سے محبت کے جذبات برانگیختہ ہوں۔'' (ص32)

طالب علمی کے زمانے میں اس ''فطری امر'' کی وجہ سے کتنے ''طلبا'' کی مردانہ وجاہت نے محبت کے جذبات کو برانگیختہ کیا؟ ''عرق ریزی'' سے کتاب لکھنے والے مصنّف کا قلم اس مقام پر خاموش ہے ۔ اب جب طالب علمی کا زمانہ بیت گیا ہے اور پروین شاکر ''فطری امر'' کے مقام سے بخیریت اگلی منزل تک پہنچ چکی ہے، مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے ۔ عشق کی ایک اور ''واردات'' آن وارد ہوئی ۔ مصنّف لکھتا ہے:

''اب صورتِ حال مختلف تھی ۔ سرکاری دفتر میں ملازمت کرنے والا ایک شخص (اپنی تمام تر کوشش اور تحقیق کے باوجود مصنّف صاحب اُس شخص کا نام دریافت نہیں کر سکے) پروین کے دل کو بھا گیا۔ پروین نے اُس کو اپنے تصوّرات اور خوابوں میں شریک کیا اور اُس کی رفاقت سے اُسے حظ حاصل ہوتا۔ پروین نے اس تعلق خاطر کو بہت سنجیدگی سے لیا اور اُس کے جذبات زیادہ گہرے تھے۔'' (ص32)

مصنّف نے اِس تحریر یا اقتباس کے آگے نمبر 6 ڈالا ہے، مگر حواشی یا حوالہ جات میں اِس کا کوئی ذکر موجود نہیں ۔ اِس اقتباس میں ایک دو باتیں بطورِ خاص اہم اور توجہ طلب ہیں ۔ پہلی بات یہ ہے کہ جو شخص پروین کے دل کو بھایا، وہ سرکاری ملازم ہے اور یہ واردات طالب علمی کے زمانے کے بعد کی ہے ۔ اِس لیے یہ شخص ''ثروت حسین'' نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ثروت حسین یونیورسٹی میں اُس کا جونیئر تھا اور یونیورسٹی میں ہی اُس سے ملاقات ہوئی تھی (اور یہ عشقیہ واردات طالب علمی کے زمانے کے بعد کی ہے) اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ''شخص'' سرکاری ''دفتر''

میں ملازم ہے۔ جبکہ ثروت حسین دفتر میں نہیں بلکہ جامعہ ملیہ کالج میں این۔ڈی۔وی۔ پی پروگرام کے تحت لیکچرار تھا۔ اِن وجوہات کی بنا پر مذکورہ شخص ثروت حسین نہیں ہوسکتا۔ پروین شاکر نے بھی 1973ء میں عبداللہ کالج برائے خواتین میں بطور لیکچرار ملازمت کرلی تھی۔ مذکورہ شخص جو سرکاری دفتر میں ملازم تھا، پروین شاکر اُس کی ''رفاقت'' سے کب اور کہاں ''حظ'' حاصل کرتی رہی اور اِس ''حظ'' کی نوعیت کیا تھی؟ یہ سوال بھی تشنہ اور وضاحت طلب ہے۔ شاید فاضل مصنّف کبھی اِس جانب توجہ فرمائیں اور اِس سوال کا جواب ڈھونڈنے اور وضاحت کرنے کی کوشش بھی کریں۔

مصنّف نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ''پروین کے جذبات زیادہ گہرے تھے۔'' ان جذبات کی پیمائش کس نے کی اور ماپنے کا پیمانہ کیا تھا؟ مصنّف نے اِس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ مصنّف صاحب مزید لکھتے ہیں:

> ''وہ لڑکا شادی کی طرف مائل نہیں ہو رہا تھا۔ اس لڑکے کی آرزو اور اُمنگ بہتر کیریئر تھا۔ اُس کا خاندانی پس منظر بھی پروین سے مختلف تھا۔ اُس کا فرقہ بھی جُدا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ ایسی شادی اُسے زندگی میں بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے معاون اور مددگار نہیں ہوگی۔'' (ص 33)

وہ ''لڑکا اگر شادی کی طرف مائل نہیں ہو رہا تھا تو کم از کم وہ ''لڑکا'' ثروت حسین نہیں ہو سکتا اور وہ اِتنا کم ظرف اور خودغرض بھی نہیں تھا کہ وہ شادی جیسے مقدّس بندھن کو کوئی کاروبار سمجھے اور اسے زندگی میں بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے معاون اور مددگار قرار دے۔ بہرحال مصنّف کے بقول:

> ''کم عمر اور جذباتی پروین کے لیے یہ سب ایک صدمہ سے کم نہیں تھا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ دل پر ایسی خراش اور ایسے زخم وقتی طور پر نہیں ہوتے بلکہ پائیدار ہوتے ہیں اور اگر حالات بہتر بھی ہو جائیں تو اِس نوعیت کے زخم کبھی نہیں بھرتے۔ اُسے احساس تھا کہ اس ''تعلق'' کے بغیر اُس کا وجود مکمل نہیں تھا۔'' (ص 33)

پھر کرنا خدا کا کیا ہوا، لڑکے کو بہت جلد اپنی ''غلطی'' کا احساس ہوگیا اور پھر اُس نے رشتہ مانگا۔ اب کے پروین بہت خوش ہوئی لیکن اُس کی اپنی فیملی کی رکاوٹیں ابھی موجود تھیں۔ مصنّف

نے لکھا ہے کہ پروین شاکر کی زندگی کے اِس پہلو سے نجمہ خانم ملک نے بھی پردہ اُٹھایا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''کراچی یونیورسٹی کے زمانے میں وہ ایک شخص (مصنّفہ نے کراچی یونیورسٹی کے زمانے کاذکرکیاہے جبکہ احمد پراچہ صاحب اِس واقعہ کا زمانہ طالب علمی کے بعد کا قرار دیتے ہیں۔ اِس تضاد کی جانب اُنھوں نے غور نہیں فرمایا) جو پروین کی زندگی اور سوچ کا انقلابی ہوا۔ پروین بے حد جذباتی اور ضدی لڑکی واقع ہوئی تھی، اِس لیے اُس نے اپنا آئیڈیل سمجھ کر مستقبل کا خواب اُنھی سے وابستہ کرلیا تھا۔'' (3) (ص 33-34)

پروین کی خواہش پر جب ''وہ'' اور اُس کے گھر والے ملنے آئے تو پروین کے والد سید شاکر حسین زیدی بہت برہم اور ناراض تھے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اُن کی بیٹی اپنی مرضی سے شادی کرلے، وہ بھی دوسرے فرقے کے فرد سے...... اپنی والدہ کے ذریعے بات طے ہونے کی ناکامی کے بعد پروین نے ''خود'' یہ مسئلہ اُٹھایا۔ اُس کے والد سخت ناراض ہوئے اور بھڑک اُٹھے۔ اُن کا عہد تھا کہ اُن کی بیٹی کی شادی وہیں ہوگی جہاں وہ چاہیں گے۔ اس سے پروین کے دل پر ایک اور زخم لگا...... اُسے اپنے والد کے انکار سے صدمہ پہنچا۔ تاہم رسم و رواج کی پابند خاتون کی حیثیت سے اُسے اپنے والدِ محترم کی خواہش کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ وہ اپنے والد کی چہیتی بیٹی تھی اور وہ اُنھیں ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' (ص 34)

اگر اِس کہانی کو سچ مان لیا جائے اور یہ فرض کرلیا جائے کہ یونیورسٹی کا وہ شخص ثروت حسین تھا، تو کم از کم زاہد حسین بھٹی اور ثروت حسین کے دیگر دوستوں نے پروین شاکر پر جو عیّاری، مکاری اور بے وفائی کے الزام لگائے ہیں، اُن سے تو پروین شاکر کا دامن صاف ہوسکتا ہے کہ اُس کی اپنی بھرپور کوشش کے باوجود اُس کے والد نے یہ رِشتہ منظور کرنے سے انکار کیا۔ ایک مشرقی عورت کی طرح اُس نے اپنے دل پر زخم کھائے، اپنی محبت کی قربانی دے کر باپ کی لاج رکھ لی۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے من میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اُس کا کردار اور

دامن اُجلا تھا۔ اُس پر اُنگلی اُٹھانا اُس کے جذبے کی بھی اور اُس کی پاک دامنی کی بھی توہین ہے۔ یہ بات راقم کی سمجھ سے بالا تر ہے کہ مردوں کے اِس سماج میں بے بس اور مجبور لڑکیوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے والی شاعرہ سے کیا جُرم سرزد ہوا ہے کہ ایسی ''عشقیہ داستانیں'' اُس کے نام سے منسوب کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اس دُکھی لڑکی (پروین شاکر) کے ''نادان دوست'' مرنے کے بعد بھی اُس کی رُوح کو چین سے کیوں نہیں رہنے دیتے؟ ''جرم'' سے بڑھ کر سزا دینے کا یہ عمل کہیں رُکے گا بھی یا نہیں؟ آخر میں پروین شاکر کی ایک نظم کا اقتباس، ایک دو حرفوں کی تبدیلی کے ساتھ۔ یہ اقتباس احمد پراچہ نے بھی کتاب کے آخر میں دیا ہے۔

بہت دل چاہتا ہے
کسی دن ''مہربانوں'' (1) کے نام لکھوں ایک کُھلا خط
لکھوں اُس میں
کہ تم نے چور دروازے سے آ کر
مِرے گھر کا تقدّس
''کِس'' (2) طرح پامال کر کے
توشہ خانے کو تصرّف میں لیا ہے

(دل چاہتا ہے)

آہ! پروین شاکر جو اَب ایسا خط بھی نہیں لکھ سکتی اور مہربانوں کو اُس کا دامن داغ دار کرنے اور اُس کے گھر کا تقدّس پامال کرنے کی کُھلی اجازت ہے۔

❀❀❀❀❀

1۔ اصل لفظ (غاصبوں)

2۔ جس

احمد پراچہ، ''پروین شاکر احوال و آثار''، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، 2003ء

❀❀❀❀❀

رفاقت جاوید

پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا

''پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا'' کی مصنّفہ رفاقت جاوید (اہلیہ ائیر مارشل قاضی جاوید) کا پروین شاکر سے 94-1989ء تک بڑا قریبی تعلق رہا۔ اِسی تعلق کی بنیاد پر رفاقت نے پرانی یادوں کو تازہ کیا ہے اور مذکورہ کتاب میں پروین شاکر کے حالاتِ زندگی اور ملازمت سے لے کر وفات تک، ترتیب وار اس کی مصروفیات، واقعات، مشاغل اور علمی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کیا ہے اور پروین شاکر کے بہت سے ''رُوپ'' سمیٹے ہیں۔ بطور بیٹی، بیوی، ایک عورت، ماں، معروف شاعرہ اور بطور مہمان و میزبان اُس کے رویّوں کا تذکرہ کیا ہے۔

مصنّفہ کے نزدیک:

> ''پروین مشرق کی بیٹی تھی اور مشرق اپنا مقام نہیں چھوڑتا۔ پروین مہذّب، شائستہ اور مشرقی قدروں کا احترام کرنے والی لڑکی تھی۔ جس میں بے باکی، بے حیائی، بے پردگی اور بے لحاظی کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا۔۔۔۔۔ اُسے عزت و تحریم اور نسوانی وقار کا پورا احساس تھا۔'' (1) (ص26)

اِس مشرقیت کے ساتھ ساتھ اُس کی شخصیت کا ایک قابلِ ستائش پہلو بقول مصنّفہ اُس کی اَنا اور خودداری تھی۔ جس کی آڑ میں شرم وحیا، رکھ رکھاؤ، وضع داری اور لحاظ جوئی پوشیدہ تھی۔ اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ وہ شرم وہ حیا والی مشرقی لڑکی تھی۔ مگر اُس کی اَنا اور خودداری نے اُس کے لیے کئی مسائل پیدا کیے۔ وہ ایک باشعور خاتون تھی۔ اُس کی نظر میں مرد اور عورت برابر تھے اور مصنّفہ کے بقول:

> ''وہ مرد کے پیچھے پیچھے نہیں، اُس کے شانہ بشانہ چلنے کو اپنا حق تصوّر کرتی تھی۔ وہ مرد کی محتاجی میں رہ کر اپنی زندگی کا زیاں کرنے کو ظلم وستم سے تشبیہ دینے والی لڑکی، اِس معاشرے کو کیسے قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔'' (ص113)

ہمارا معاشرہ، مرد کا معاشرہ ہے۔ یہاں مرد کی حاکمیت ہے اور عورت کے کردار و عمل کو

C 5/8/2025 9:41 PM PAGE 197 (1,1)

تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اُسے ہر معاملے میں کم تر اور دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے اور یہ کہہ کر اُس کے عقل و شعور کی تذلیل کی جاتی ہے کہ عورت کی تو عقل ہی اُس کی ''گُت'' کے پیچھے ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے معاملات کو کیا جانے اور بقول مصنّفہ:

> ''معاشرے کا دُوسرا نام مرد ہے، جو عورت کو سر اُٹھا کر چلنے، آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے اور اپنے علم و ہُنر سے برتر ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ مسئلہ اَنا کا ہے۔ یعنی احساسِ برتری کو چیلنج کرنے کا خوف۔'' (ص114)

گو اللہ تعالیٰ نے پروین شاکر پر اپنی بہت عنایات اور نوازشات کی تھیں، مگر اُس کی اَنا، خودداری اور مرد کے شانہ بشانہ چلنے کے تصوّر کو معاشرے نے قبول نہیں کیا اور اُس کی ایک ''ناکامی'' ہی اُس کی زندگی کا روگ اور لوگوں کے لیے تماشا بن گئی۔

مصنّفہ نے ''کچے دھاگے کا رِشتہ'' کے عنوان سے پروین شاکر کی ازدواجی زندگی اور پھر اس میں ناکامی کے حوالے سے بڑے محتاط انداز میں کچھ باتیں تحریر کی ہیں، جس سے بات پورے طور پر تو واضح نہیں ہوتی مگر کچھ اشارے ملتے ہیں۔ جس سے بات کو سمجھنے میں تھوڑی سی آسانی ضرور ہو جاتی ہے۔ مصنّفہ نے پہلے تو جو لوگوں کا خیال یا قیاس آرائیاں تھیں اُن کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''اِبتدا میں پروین کو ''ایک شخص'' سے لگاؤ ہوا۔ مگر چُونکہ اُن کا تعلق مختلف ''عقیدہ'' سے تھا، اِس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی، جس کی وجہ سے پروین کی شاعری میں ٹریجڈی کی جھلک نظر آتی ہے۔'' (ص97)

مگر یہ صرف لوگوں کا خیال تھا (یہ کون لوگ تھے، مصنّفہ نے یہ وضاحت نہیں فرمائی) اصل حقیقت کیا تھی، اس کی وضاحت کرتے ہوئے مصنفہ نے لکھا ہے کہ:

> ''پروین کی بچپن کی نسبت کو والدین نے غور و خوض کے بعد ٹھکرا دیا تھا کیونکہ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی نہ تھی۔'' (ص97)

پروین بے حد کھری اور شفاف لڑکی تھی۔ کسی کو دھوکے میں رکھ کر وقت گزاری کرنا اور

بے وقوف بنانا اُس کی فطرت میں تھا ہی نہیں۔ اِس لیے بچپن کی نسبت کو ختم کرنے میں پروین کی اپنی رائے بھی شامل تھی۔ مگر پھر وہ ڈپریشن کا شکار کیوں ہوئی؟ لوگوں کی رائے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مصنّفہ نے اس کی وضاحت اپنے انداز میں کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''اگر اُس نے اپنی پسند کا اظہار کیا بھی تھا تو یہ حق اُسے اسلام نے سونپ رکھا تھا۔ والدین کے انکار کی صورت میں مشرقی لڑکی ہونے کے ناطے سرِ تسلیم خم کرنا اُس کی فرماں برداری کی غمازی کرتا ہے۔ اُس کے لیے والدین کی خوشی، عزت اور محبت کو اہمیت دینا لازم تھا۔ لیکن مضمحل ہونا بھی انوکھی بات نہ تھی۔ کچھ ذہنی طور پر افسردہ اور پشیمان رہنے سے ڈپریشن میں چلی گئی۔'' (ص99)

یہ باتیں کہاں تک سچ تھیں؟ مصنّفہ کو خود اِس کے بارے میں صحیح معلوم نہیں، کیونکہ اس کا اقرار اُس کی زبان اور اپنوں سے سُننے میں نہیں آیا تھا۔ سب دوسروں کی قیاس آرائیاں تھیں۔ لیکن ایک بات سچ ہے کہ اسی بیماری کے دوران ڈاکٹر نصیر سے زیادہ رابطہ ہوا۔ ڈاکٹر نصیر رشتے میں پروین کے کزن تھے اور پروین کے والدین نے اُس کے علاج کے لیے ڈاکٹر نصیر سے مشورہ لینا مناسب سمجھا تھا اور اُن کی موجودگی ایسی کارگر ثابت ہوئی تھی کہ پروین سنبھلنے لگی۔ اور پھر:

''ایک دن اُس خوبرو جوان کا رشتہ آ گیا۔ والدین کو رشتے کی تلاش تھی۔ پروین کا رویّہ بھی مثبت تھا۔ والدین کو نصیر فطرتاً پسند تھا۔ کیونکہ وہ شریف النفس اور کم گو تھا۔ اُس کا مستقبل بھی روشن نظر آ رہا تھا، اِس لیے بغیر کسی حیل و حُجت کے 1976ء میں رشتے کی کامیابی کے لیے دُعائے خیر پڑھی گئی۔'' (ص98)

ہر لڑکی کی تمنّا اور خواہش کی طرح پروین کو بھی ایک پیار کرنے والا، روشن مستقبل والا خوب رُو خاوند ہی نہیں، بلکہ ''بھیڑیوں'' کے اِس معاشرے میں اُس کی عزت و آبرو کا محافظ بھی مل گیا۔ اور بقول مصنّفہ:

''اولادِ نرینہ کے بعد اُسے اپنے روشن مستقبل اور خوش حال دِنوں پر بھروسہ ہو گیا۔ وہ سمجھی کہ اب زندگی مکمل ہو گئی ہے، کہیں بھی خلا نظر نہ آیا۔ اور پھر

جب اُس کے اس تسلی بخش احساس پر بے اعتباری کی مُہر ثبت ہوئی تو اپنا ئیت بھی
غیریت میں بدل گئی اور دل ٹوٹ گیا۔''(ص129)

اپنائیت، غیریت میں کیسے بدلی، یہ رشتہ کچا دھاگہ کیسے بنا، تسلی بخش احساس پر بے اعتباری کی مُہر کیسے لگی، مصنّفہ نے اس کا پس منظر بیان نہیں کیا۔ البتہ یہ بتایا ہے کہ مراد کی پیدائش کے وقت:

''نصیر رِشتہ داروں اور ماں کے کہنے پر مراد کو دیکھنے میں تاخیر کرنے
لگے ۔۔۔۔ البتہ پروین کے رونے دھونے پر اُن کی تشریف آوری دو دِن بعد
ہوئی۔'' (ص100)

نصیر کی ماں اور دیگر رِشتہ داروں کا یہ رویّہ کیوں تھا؟ گو مصنّفہ نے اِس پر روشنی نہیں ڈالی، البتہ بہت بعد کے دِنوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ پروین کو:

''سسرال کے ہر رِشتے سے وحشت محسوس ہوتی تھی اور وہ اُن کے
ذکر ہی سے خوف زدہ ہو جایا کرتی تھی۔ اُسے ان رشتوں سے کبھی شفقت و محبت اور
ہمدردی کی قطعاً توقع نہیں ہوتی تھی۔''(ص176)

اب نجانے سسرال میں پروین پر کیا گزری تھی کہ اُسے اُن سُسرالی رِشتوں سے وحشت محسوس ہوتی اور اُن سے کسی قسم کی شفقت و محبت تو دُور کی بات، ہمدردی کی بھی توقع نہیں رہی تھی؟ مراد کی پیدائش کے وقت ڈاکٹر نصیر کی بے رُخی سے ان رشتوں کے رویّے کے بارے تھوڑا بہت اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔ یہاں مصنّفہ عورت کے رویّے اور مزاج کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اُس کی سائیکی کی بھی وضاحت کرتی ہے کہ:

''عورت مرد کی تمام کوتاہیوں اور بے اعتنائیوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پا
کر دل کو پاک وصاف کر لیتی ہے کہ اُس کا گھر بچا رہے۔ اُس کی چھت چاہے سیلن
زدہ ہی کیوں نہ ہو، اُسے تحفّظ کا احساس دلاتی رہے۔''ص127)

مرد کی اِس مسکراہٹ میں کیا سرشاری اور جادو ہے؟ پروین شاکر نے اپنی ایک نظم میں اِسے اِس طرح بیان کیا ہے:

’’اپنے بیٹے کے لیے ایک نظم‘‘

زمانہ
میرے خدشوں سے سوا عیار تھا
اور زندگی
میری توقع سے زیادہ بے مروّت تھی
تعلق کے گھنے جنگل میں
بچھّو سرسراتے تھے
مگر ہم اس کو ’’سرشاری‘‘ میں
فصلِ گُل کی سرگوشی سمجھتے تھے

(انکار)

گو پروین شاکر نے تلوّن مزاج لوگوں کی جبلّت کو سمجھ لیا تھا، پھر بھی ’’ماں‘‘ بننے کے بعد اُس نے اپنے گھر کو آباد اور خوش حال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے لیے قربانی اور ایثار کے لیے بھی ہر لمحہ تیار رہی۔ مگر ’’ہونی‘‘ ہو کر رہی اور میاں بیوی میں علیحدگی ہو گئی۔ پروین شاکر نے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں یہ فقرہ کہا تھا:

’’زندگی نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔‘‘

اِس فقرے میں اُس کی زندگی کی تمام سرگزشت موجود ہے۔ گو زندگی نے اُسے بہت کچھ دیا تھا، مگر معاشرے نے اُس سے چھینا بھی بہت کچھ تھا۔ اُن کی علیحدگی کے بارے مصنّفہ نے لکھا ہے کہ:

’’ڈاکٹر نصیر طبعاً بہت خوب انسان تھے، مگر اُن کی آپس میں نہ بن سکی۔
دراصل پروین اور نصیر مختلف دُنیاؤں کے دو باشندے تھے۔ زندگی کے بارے دونوں

کے خیالات مختلف تھے۔ اِن باتوں کے باوجود پروین اپنے ازدواجی رِشتے کو مضبوط اور اپنے گھر کو ہنستا بستا دیکھنا چاہتی تھی۔'' (ص107)

پروین کی خواہش اپنی جگہ مگر اُس کی انا، خودداری اور پھر اُس کی شاعری، والدین اور شوہر کے لیے باعثِ ندامت ہوگئی۔ والد اور شوہر کی ناراضی، حد درجے کی سختی اور لعن طعن مقدّر بن گیا۔ مصنّفہ لکھتی ہیں:

''اُسے ہمیشہ شادی کا فیصلہ کرنے اور پھر شادی کے ٹوٹ جانے کا پچھتاوا رہتا تھا۔ پہلا فیصلہ بھی جائز تھا، کیونکہ مرد کے بغیر اور کوئی رِشتہ عورت کو تحفظ فراہم نہیں کرسکتا۔'' (ص150)

اور دوسرا فیصلہ؟ پروین نے ایک بار مصنّفہ سے کہا تھا:

''عورت اور مرد کو اللہ تعالیٰ نے یکساں صلاحیتوں کے ہمراہ یکساں احساسات و جذبات کے ساتھ ایک ہی طریقے سے پیدا کیا ہے، تو پھر عورت اپنے شوہر کے لیے گالی کیسے ہوگئی، اُس کی پراپرٹی کیسے بن گئی؟ شوہر سے نبھاہ کی کچھ شرائط ہوتی ہیں ۔نصیر ان سے بے خبر تھا۔ وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا کہ ایک عورت کے بھی کچھ ''حقوق '' ہوتے ہیں۔ وہ بھی اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر اپنی زندگی اپنی پسند سے گزارنے کا حق رکھتی ہے۔'' (ص150)

پروین کی بات حرف بہ حرف صحیح ہے۔ اس سے اختلاف ممکن ہی نہیں ہے کہ عورت کے بھی حقوق ہیں اور اُسے بھی اپنی پسند سے زندگی گزارنے کا حق ہے، مگر مرد کے اِس معاشرے میں کوئی بھی ''نصیر'' اسے سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ رشتوں کو کچے دھاگے کی طرح توڑ سکتا ہے مگر عورت کو حقوق نہیں دے سکتا۔ پروین شاکر کو یہ رِشتہ ٹوٹنے کا قلق عمر بھر رہا۔ اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مصنّفہ سے کہا:

''رف (رفاقت) میں تو بہت نادان نکلی ۔اُس کا نام میرے نام کے ساتھ جُڑا ہی رہتا۔ میں طلاق کے خلاف آواز اُٹھاتی، احتجاج کرتی۔ میں نے اُس کا کہا کیوں مانا؟ بے شک وہ دوسری شادی کر لیتا۔ اُس کا نام میرے سر کی چادر ہوتا۔

وہ میرا لباس ہوتا۔‘‘(ص151)

مرد دوسری شادی کرے، یہ عورت کے لیے بڑا عذاب ہے،مگر علیحدگی، یہ اس سے بھی بڑا عذاب ہے۔ جسمانی تقاضے اپنی جگہ،لیکن تنہائی، اس سے پیدا ہونے والا کرب اور پھر عدمِ تحفّظ کا احساس بڑا اذیت ناک ہے۔ پروین شاکر جیسی حسّاس لڑکی نے تو قُرّۃ العین حیدر جیسی جہاں دیدہ عورت کی تنہائی، کرب اور پھر چڑچڑے پن کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

’’عورت کو ہر صورت اور ہر حال میں ایک بار شادی کرنے کا فیصلہ ضرور کرنا چاہیے۔‘‘(ص56)

اور قرۃ العین حیدر کے لیے لکھی نظم میں بھی ایسی کیفیت کا تذکرہ ہے:

جیون زہر کو متھ کر امرت نکالنے والی موہنی
بھرا پیالہ ہاتھوں میں لیے پیاسی بیٹھی ہے
وقت کا راہو گھونٹ پہ گھونٹ بھرے جاتا ہے
دیوی بے بس دیکھ رہی ہے
پیاس سے بے کل ہے۔۔۔اور چُپ ہے

(نظم ’’قرۃُ العین حیدر سے‘‘ صد برگ)

دوسروں کی تنہائی کو محسوس کرنے اور اس پر بے کل ہونے والی لڑکی نے اپنی تنہائی کو کیسے محسوس کیا ہوگا؟ وہ حسرت و یاس میں ڈوب گئی۔ یہ ناکامی زندگی کا سب سے بڑا روگ بن گئی اور وہ تمام عمر اِس احساس سے باہر نہ نکل سکی۔ مصنّفہ کہتی ہے:

’’وہ عید پر نئے کپڑے پہننے سے گھبراتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ ’’میں سہاگن نہیں ہوں۔ میرے لیے عید پر بننا سنورنا واجب نہیں۔ یہ مجھے زیب نہیں دیتا۔‘‘(ص195)

مصنّفہ نے ایک اور واقعہ بھی تحریر کیا ہے جس سے پروین شاکر کے ذہنی کرب، احساسِ تنہائی اور دُکھ کا اِظہار، پچھتاوے، غم اور افسوس کا پتہ چلتا ہے۔ مصنّفہ لکھتی ہے:

''پروین نے اسلام آباد میں گھر لیا تو میں نے اُس کے گھر کو پیار،لگن، چاؤ اور قرینے وسلیقے سے سجا دیا تھا۔ پروین نے گھر کو پُرستائش نظروں سے دیکھ کر میرا ہاتھ پکڑ کر حسرت و یاس بھرے لہجے میں نم آلود آنکھوں سے دیکھ کر کہا:''رف، جب میرا گھر اُجڑ رہا تھا تو اُس وقت آپ کہاں تھیں؟ کاش اُس وقت آپ کا ساتھ ہوتا تو میرا گھر بچ گیا ہوتا۔''(ص194)

جب اُس کا ''اپنا گھر'' نہ بچا تو اُس نے اپنے بیٹے مراد کے ہمراہ اسلام آباد میں گھر کرایہ پر لے لیا۔ مصنّفہ نے اس گھر کو ''شیشے کا گھر'' کہا ہے۔ ایسا گھر جس کے گرد و پیش ایک ہجوم تھا جو اُس کی ایک ایک حرکت پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس بھیڑ میں اُس کے اپنے کولیگز، سینئر افسران، دوست احباب اور رشتہ دار سرِ فہرست تھے اور:

''اُس کی ہر اَدا پر اعتراض ہونے لگا۔ مشرقی روایات کے ٹھیکے داروں نے شیشے کا گھر توڑ کر اُسے سنگلاخ آہنی قلعے میں مقیّد کرنا چاہا، تاکہ نئی نسل کے جواں خون میں جو حِدّت سما گئی ہے اور دِلوں میں آزادیِ نسواں نے جو ہلچل مچا دی ہے اُس پر بر وقت قابو پا لیا جائے اور اُس کے قلم کو توڑ دیا جائے۔''(ص114)

اُس نے نسوانی وقار و تحریم، آزادی اور حقوق کے حصول کے لیے جو قلم اُٹھایا، وہی اُس کا جرم بن گیا۔ معاشرے نے اُس کی ذہانت، شہرت اور شاعری کو بے راہ روی، بدکرداری، بے حیائی اور بے باکی کا نام دے کر اُس کی پاکیزگی پر خوب کیچڑ اُچھالا۔ مصنّفہ کہتی ہے:

''وہ کبھی اضطراری کیفیت میں سوچا کرتی تھی کہ وہ اُسے کس گناہ کی پاداش میں زندہ درگور کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا اور اپنے ہمراہ اِس معاشرے کی ہر اُداس لڑکی کو شامل کر لینا، جن کی کہیں بھی شنوائی نہیں، جرم تو نہیں۔۔۔۔۔۔میرا جنسِ مخالف کے حقوق پر اِجارہ داری کرنے کا اِرادہ تو نہیں، جو انتقام کی صورت میں اُبھرا اور چارسُو اس کی سڑاند پھیل گئی۔''(ص115)

ٹھیک ہے ''خوشبو'' کی شاعری، ایک ناتجربہ کار دوشیزہ کے کنوارے جذبات کی عکاسی ہے۔ وہ ایسے تخلیقی خیالات کی نشان دہی کرتی دکھائی دیتی ہے جس کے جذبات و

احساسات میں کم سِنی کی تشنگی اور بے صبری، نوخیز اُٹھتی جوانی کی دیوانگی کی طرف اشارے ہیں۔

مصنّفہ کہتی ہے کہ اُس کی شاعری میں جس عشق و محبت کا انکشاف ہوا ہے وہ اپنی پریکٹیکل لائف میں اس سے کوسوں دُور تھی۔ اُس کی ذات سے شاعری کے انداز کو ہٹا کر تجزیہ کیا جائے تو اُس کے ظاہری اور باطنی کردار میں رتی بھر فرق محسوس نہ ہوگا۔ اُس کی شاعری اُس کی اپنی آپ بیتی نہیں ہے، بلکہ مصنّفہ کے بقول:

> ''ہمارے معاشرے کے گُھٹن زدہ ماحول کے چاروں اطراف ایسی بے شمار لڑکیاں موجود ہیں جو رُومانی وجذباتی احساسات اور نسوانی آزادی کی خواہش مند ہیں۔ لیکن وہ قید و بند کی صعوبتوں سے ہم کنار ہیں، جن پر جبر و تشدّد کے خلاف بغاوت کرنے کے تمام راستوں پر مختلف رشتوں کی صورت میں پہرے دار موجود ہیں۔ پروین کی شاعری اُنھیں خوابوں کی آماجگاہ سے باہر نکال کر اپنے حقوق پر بالا دستی حاصل کرنے کی تلقین کرتی ہے۔'' (ص 122-121)

اپنی نظم ''صرف ایک لڑکی'' میں وہ سب لڑکیوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے:

صرف ایک لڑکی

اپنے سرد کمرے میں
میں اُداس بیٹھی ہوں
نیم وا دریچوں سے
نم ہوائیں آتی ہیں
میرے جسم کو چُھو کر
آگ سی لگاتی ہیں
تیرا نام لے لے کر

مجھ کو گدگداتی ہیں
کاش میرے پر ہوتے
تیرے پاس اُڑ آتی
کاش میں ہوا ہوتی
تجھ کو چُھو کے لوٹ آتی
میں نہیں مگر کچھ بھی
سنگ دل رواجوں کے
آہنی حصاروں میں
عمر قید کی ملزم
صرف ایک لڑکی ہوں

(خوشبو)

جذبات سے بھرپور یہ شاعری ذاتی زندگی کی کہانی نہیں ہے بلکہ ہر معصوم لڑکی کی کہانی ہے جو رواجوں کے آہنی حصاروں میں عمر قید کاٹ رہی ہے۔ پروین شاکر نے معاشرے کی مجبور لڑکیوں کی دل آزاریوں کو بیان کیا ہے۔ اُس نے ان کی مجبوریوں اور دلی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اِس معاشرے کی ہر ''گڑیا'' اُس کی ہم جولی ہے۔ اپنی ایک نظم میں اُس نے ان گڑیوں کی داستان لکھی ہے۔

نِک نیم(Nick Name)

تم مجھ کو گُڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو
کھیلنے والے سب ہاتھوں کو

میں گڑیا ہی لگتی ہوں
جو پہنادو، مجھ پہ سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں
جس بچے کے ہاتھ تھمادو
میری کسی سے جنگ نہیں
سوچتی جاگتی آنکھیں میری
جب چاہے بینائی لے لو
کُوک بھرواور باتیں سُن لو
یا میری گویائی لے لو
مانگ بھرو، سیندور لگاؤ
پیار کرو، آنکھوں میں بساؤ
پھر جب دل بھر جائے تو
دل سے اُٹھا کر طاق میں رکھ دو
تم مجھ کو گُڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو

(صد برگ)

شاعر اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سماج اور عہد کا بھی ترجمان ہوتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے ماحول کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں اس گُھٹن زدہ ماحول اور اس میں پلنے والی مجبور لڑکیوں کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ اُس کے اپنے بیتے دِنوں کی گواہی نہیں ہے۔ مصنّفہ نے یہاں ایک اور اعتراض بھی اُٹھایا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''مِرے ہمراہ بھی رُسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمھارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں''

جب ایک شاعر اس قسم کے اظہار میں کنجوسی نہیں برتتا تو اُس پر اُنگلی نہیں اُٹھائی جاتی۔ اُس کے ماضی کو داغ دار نہیں کہا جاتا۔ جب ایک شاعرہ اس کا اظہار کرتی ہے تو اُس کے ماضی کو ذاتی کمزوریوں سے منسوب کر دیا جاتا ہے اور اِنھیں شعروں سے اُس کا امیج چار سُو گردش کرنے لگتا ہے۔ یہ کہیں سے بھی انصاف نہیں، سراسر زیادتی ہے۔'' (ص135)

مصنّفہ بھی کیا سادہ ہیں۔ کیا اُنھیں پتہ نہیں کہ مرد کچھ بھی کرے اُس کا ماضی داغ دار نہیں ہوتا بلکہ ایسے کاموں اور جواں مردی پر وہ فخر کرتا ہے۔ بھیڑیوں اور بچھوؤں سے بھرے جنگل جیسے اِس معاشرے میں صرف عورت کی چُنری کو داغ لگتا ہے۔ اور ہرنی کو بھیڑیوں سے انصاف کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ پروین شاکر کا پیغام، محبت کا پیغام ہے۔ اُس نے بے بس، مجبور لڑکیوں کے خاموش جذبات کو زبان دی۔ وہ کم سِنی میں ہی جوان نسل کے دِلوں کے تار چھیڑنے میں کامیاب رہی، اور پھر اُس کے کردار پر الزامات اور تہمتوں کی بھر مار کر دی گئی۔ اُس کی پاک دامنی کو داغ دار کرنے کی کوشش کی گئی۔ نئی نسل کو باغی اور سرکش بنانے کا الزام اُس پر عائد کر دیا گیا۔ اُس کی شاعری جس میں محبت کی جستجو، پا لینے کی خواہش اور پھر دھوکہ و فریب کی اذیت، کسک اور چبھن کا کرب، ان تمام حادثات کو اُس کی ذات کے ساتھ منسوب کر کے اُس کا ایسا امیج بنا کر پیش کیا گیا جو معاشرے کے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔ اُس کی شاعری ہی اُس کا جُرم بن گئی۔ قدم قدم پر اُسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مصنّفہ نے لکھا ہے کہ:

''پروین شاکر ایک خوب صورت اور سحر انگیز شخصیت کی مالک تھی۔ جاذبِ نظر ایسی کہ بار بار بات کرنے کو دل چاہے اور پھر شاعری میں تھوڑی سی بے باکی، وہ لوگوں کی نظر میں چڑھ گئی تھی۔ پھر اُس نے خود کو دوسروں سے دُور کر لیا تھا۔ محتاط رہنا اُس کا وطیرہ بن چکا تھا۔

مصنّفہ لکھتی ہے: ایک دن اُس نے سوچتے ہوئے مجھے ایک ذو معنی بات کہی:

''رف ، آئی ایم سٹل ینگ۔ اس وقت بھی حفاظتی بند باندھنے کی اشد ضرورت ہے۔''(ص64)

اپنے تحفظ کی خاطر پروین اپنے بڑھاپے کی تہہِ دل سے خواہش بھی کیا کرتی تھی۔ اُس کی یہ خواہش تو پوری نہ ہوئی، حسد وعناد کی نظروں نے اُسے بھری جوانی ہی میں ہڑپ کرلیا اور وہ 26 دسمبر 1994ء کو مردوں کے اِس معاشرے میں اپنا کردار ادا اور بھرپور احتجاج کرتے ہوئے مٹی کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو گئی، مگر اپنے زندہ وجاوداں نقش چھوڑ کر گئی ہے۔ ایسے نقش جو اُردو ادب سے کبھی بھی مِٹ نہ سکیں گے۔

کتاب میں مصنّفہ نے پروین شاکر کا کردار، شاعرانہ مزاج، اُس کی خودمختارانہ سوچ کے وہ پہلو جن پر عورت کو آواز اُٹھانے کا حق ہے، جسے سراہا بھی گیا اور تنقید بھی کی گئی اور اپنے اپنے طریقوں سے انتقام بھی لیا گیا، اُسے اُجاگر کیا ہے۔ پروین مشرق کی ایک بیٹی تھی اور مشرق اپنا مقام نہیں چھوڑتا، پروین کے اِسی باوقار روپ کو نمایاں کیا ہے۔

مصنّفہ نے کتاب میں پروین شاکر کی خوشونت سنگھ سے ایک ملاقات کا حال بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مصنّفہ لکھتی ہے:

''خوشونت سنگھ نے پروین کو پُر اِشتیاق نظروں سے دیکھا اور بے اختیاری سے بولے ''کُڑی تے بڑی سوہنی اے جی ، اپنی شاعری دی طرح''

۔۔۔۔اور پھر واپسی پر پروین کی طرف دیکھ کر چھیڑنے کے انداز میں بولے:

''کُڑیئے گھر جا کے ذرا نظر اُتار لویں۔ مینوں ڈر اے، اج میری نظر لگ جائے گی تینوں۔'' پھر سنجیدگی سے بولے:

''ہمارے معاشرے کے اِس گھُٹن زدہ ماحول میں تم جیسی آزادیِ نسواں کی جنگ میں حصّہ لینے والی مجاہدہ نئی نسل کے لیے رول ماڈل ثابت ہوگی۔ اور تمھاری شاعری کا ہر لفظ اُن کے رگ و ریشہ میں ایسے سرایت کر جائے گا کہ اُن کے لیے عملی زندگی میں قیدِ بامشقّت سے رِہائی تک کا سفر آسان اور سہل ہو جائے گا۔ گُڈ شو پروین۔ کیپ اِٹ اپ (Keep it up) نسوانی جذبات کی ترجمانی کرنے کا جواب

نہیں۔ اور پھر کہا’’ آپاں پیار کر سکدے آں تے ایہہ حق کُڑیاں نوں وی حاصل اے۔‘‘(ص150-153)

خوشونت سنگھ جیسے لبرل لوگ معاشرے میں کہاں ہیں؟ ہماری کہنے کی باتیں ہیں۔ ہم کُڑیوں (لڑکیوں) کو یہ حق نہیں دے سکتے۔ ہمارے معاشرے میں حق تو دُور کی بات، ایسا لفظ بھی زبان پر لانے کی کم سے کم سزا موت ہے۔ ہمیں تو’’سوہنیاں کُڑیاں‘‘ اچھی لگتی ہیں، اور رہی اُن کی سوہنی شاعری، وہ تو ایک جرم ہے، سنگین جرم۔

معروف دانشور اور شاعرہ شاہین مُفتی نے کبھی کہا تھا:

’’کوئی شاعر شریف نہیں ہوتا۔‘‘(2)

یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے اور اس کی تہہ میں بہت کچھ چُھپا ہوا ہے۔ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اِس جملے کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے:

’’سوہنی کُڑی‘‘ دیکھ کر کوئی مرد بھی شریف نہیں رہتا۔‘‘

آخر میں بغیر کسی تبصرہ کے پروین شاکر کی ایک نظم:

ٹماٹو کیچپ

ہمارے ہاں
شعر کہنے والی عورت کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے
ہر’’مرد‘‘ خود کو اُس کا مخاطب سمجھتا ہے
اور چونکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا
اِس لیے اُس کا دُشمن ہو جاتا ہے

(انکار)

اور پروین شاکر کو تمام عمر اِسی دُشمنی کا سامنا رہا۔ تانیثیت کی ساری تحریک کے باوجود سوسائٹی میں مرد کا رویّہ اور ذہنیت یہی ہے اور اس میں کسی تبدیلی کا بظاہر اِمکان بھی نہیں۔

❀❀❀❀❀

حواشی

1۔ رفاقت جاوید، ''پروین شاکر جیسا میں نے دیکھا''، اسلام آباد، پروین شاکر ٹرسٹ، ص26

نوٹ: اِس کتاب سے متن میں جتنے اقتباسات ہیں اُن کا صفحہ نمبر وہیں درج کر دیا ہے۔

2۔ شاہین مفتی کا یہ جملہ ظفر اقبال صاحب نے اپنے کالم ''دال دلیا'' روزنامہ دُنیا لاہور 10 دسمبر 2017ء میں درج کیا ہے۔

پروین شاکر، سوانحی خاکہ و دیگر مضامین

نجمہ خانم ملک

محترمہ نجمہ خانم ملک کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے یہ کتاب پروین شاکر کی بڑی بہن نسرین شاکر کی زیرِ نگرانی ترتیب دی ہے۔ اِس لیے اس میں پروین کی زندگی کے حوالے سے جو باتیں اور واقعات ہیں، وہ مستند ہیں۔

کتاب میں پروین شاکر کے بچپن سے لے کر سفرِ آخرت تک زندگی کے تمام اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

اِس کے علاوہ ''اجل کی دستک'' کے نام سے نظم ہے جس بارے نسرین شاکر کا کہنا ہے کہ:

> ''گیتا انجلی کے ترجمہ کے بعد گزرے ہوئے احساسات کی ترجمانی ہے
> جو خود کے لیے اجل کی دستک بن گئی۔'' (ص73)

اور ''26 دسمبر کے سانحہ کی شام'' نسرین شاکر کی نظم ہے۔ ''پروین شاکر'' کے عنوان سے دو شعرا کرم ذکی علی پوری کے اور آخر میں پی۔آئی۔اے کے انجینئرنگ آفیسر خالد محمود خان کی نظم ہے ''پیارے گیتو سیّد مراد علی اور سب کی نذر''۔

نظم میں کوئی شعری حُسن تو نہیں ہے، البتہ گیتو کے لیے ڈھیر ساری دُعائیں ہیں۔

کتاب میں ایک مضمون ڈاکٹر ناظم جعفری صاحب کا ہے۔ ڈاکٹر ناظم جعفری صاحب بنارس (بھارت) میں مقیم ہیں اور حسن عسکری عظیم آبادی کے نواسے ہیں۔ حسن عسکری عظیم آبادی پروین کی نانی کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ابتداء میں پروین نے شاعری میں اُن سے اصلاح لی

اور پروین بھی اُنھیں ''نانا'' ہی کہا کرتی تھی۔

ڈاکٹر ناظم اور اُن کی بیگم ڈاکٹر نسیم بنارس میں پریکٹس کرتے ہیں۔ پروین شاکر انڈیا جاتیں تو اپنے اس بھائی کے ہاں ٹھہرا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر ناظم جعفری صاحب نے بھی اپنے مضمون میں زیادہ تر پروین شاکر کی ہندوستان میں مصروفیات ہی کا ذکر کیا ہے۔ مگر کہیں کہیں پروین کے مزاج اور اُس کی نجی زندگی کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جس سے پروین کی شخصیت، حالات و واقعات اور شاعری کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں:

> ''پارہ (پروین) کی شادی 1976ء میں ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی۔ پارہ کی زندگی اور سوچ کو نیا رُخ دینے والا یہی دَور ہے۔ پارہ کے شوہر سروس کی وجہ سے باہر رہتے تھے اور اُس کی سسرال قدیم روایتی انداز سے سوچتی تھی جو کہ پارہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کافی دِنوں وہ اِس کوشش میں رہی کہ اس ماحول میں خود کو ڈھال لے مگر وہاں روز نئی آفت، نیا کرب۔۔۔۔۔۔کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ حسّاس آدمی کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ یہی کچھ پارہ کے ساتھ بھی تھا۔ آسائش کے تمام سامان مہیا ہونے کے باوجود وہ کبھی خوش نہیں رہی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک دبیز چادر پھیلی ہوئی تھی، جس کے پیچھے ہزاروں شکوے، لاکھوں شکایتیں تھیں۔ اِس کے باوجود پاکستان میں بہت کم لوگ ہوں گے، جنھوں نے پارہ کی زبان سے کوئی حرفِ شکایت سُنا ہو۔ مگر اِس شدتِ احساس کو کیا کیجیے جو اُسے ہر وقت مضطرب رکھتی تھی۔'' (ص 80-81)

سسرال میں جو ہر روز نئی آفت اور نیا کرب اور پروین کی زندگی پر اس کے اثرات کا ذکر کرنے کے بعد، ڈاکٹر ناظم جعفری صاحب اُس کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یوں تو ہر شاعر اپنے اشعار میں جھلکتا ہے۔ کہیں نہ کہیں اپنے حالات کے پس منظر میں شعر کہتا ہے، مگر پروین شاکر کچھ اِس قدر شدت پسند تھی کہ اپنے

حالات کے اظہار میں کہیں بھی تکلّف سے کام نہیں لیا۔بعض اشعار میں اُس کی پوری شخصیت نمایاں ہے۔"(ص87)

ڈاکٹر صاحب نے بہت سے اشعار دیے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

اوروں کا ہاتھ تھامو ، اُنھیں راستہ دِکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر ،تم کو اِس سے کیا

ہر شخص مجھے تجھ سے جدا کرنے کا خواہاں
سُن پائے اگر ایک تو دس جا کے جڑے وہ

میں برگ برگ اُس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا

میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر اے خدا لگ گئی
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہوئے بد دُعا لگ گئی

کہاں سے آتی کرن زندگی کے زِنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی در ہی نہ تھا

بھیڑیے مجھ کو کہاں پا سکتے
وہ اگر میری حفاظت کرتا

لوٹا ہے وہ پچھلے موسموں کو
مجھ میں کس رنگ کی کمی تھی
ہر چیز فاصلے پہ نظر آتی ہے مجھے
اِک شخص زندگی میں ہُوا مجھ سے دُور کیا

اشعار درج کرنے کے بعد ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

''ہر غزل میں ایسے شعر موجود ہیں جو پروین شاکر کی زندگی کے لیے آئینہ ہیں۔ ہر شعر میں پروین شاکر اپنے حالات اور جذبات کے ساتھ موجود ہے۔''
(ص93)

اللہ نے پروین شاکر کو حسب نسب، علم، دولت، عہدہ، شہرت اور عزت سبھی کچھ بخش رکھا تھا۔ اِسی بُنیاد پر اُس کے مخالفین بھی بہت تھے اور مختلف زمروں میں بٹے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ناظم جعفری صاحب کے بقول:

''پارہ جب کسی محفل میں جاتی تو اُس کی ہم عمر لڑکیاں خود کو کمتر سمجھنے لگتی تھیں۔ اُن کا حُسن ماند پڑنے لگتا تھا۔ بھلا یہ کسی لڑکی کو کب پسند آتا، لہٰذا چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ علم پر بھی لوگ حسد رکھتے تھے۔ سامنے کی لڑکی اور کمشنر کی پوسٹ پر ہے۔ اُس کا C.S.P ہونا اُن کو پسند نہ تھا۔ کچھ ایسے تھے جو یہ چاہتے تھے کہ اب تم C.S.P ہو چکی ہو، لہٰذا سرکاری کام کے ساتھ ہم لوگوں کے کام بھی کرو۔ یہ پارہ کو منظور نہ تھا۔ اُس کی شہرت اور عزت بھی بہت سے لوگوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ۔۔۔۔۔ اُس کے ہم عصر شعراء بھی اُس کے خلاف تھے۔ غزل کا معیار ہو یا نظامت کے فرائض پروین شاکر ہر جگہ دوسروں سے بہتر نظر آتی تھی۔ اُردو شعراء اُس کو بڑی مشکل سے برداشت کر پاتے تھے۔ عزیزوں میں مخالفین کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ طرح طرح کے الزامات اور نئی نئی تہمتیں تراشنا اُن کا آئے دن کا کام تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے پروین کی خوش حال زندگی کو جہنم بنا دیا۔ جب اُس کے شوہر کی طرف

سے طلاق کا اعلان ہوا تو اندر ہی اندر یہ لوگ بہت خوش تھے۔‘‘(ص97-98)

ڈاکٹر ناظم جعفری صاحب نے پروین شاکر کے مخالفین اور مخالفت کے اسباب بھی تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ یہ لوگ واقعی اُس کی شہرت، ترقی اور عزت سے حسد کرنے والے لوگ تھے جو اُن کے مقام و مرتبے تک پہنچنے کی اہلیت تو نہیں رکھتے تھے مگر اُس کے پر کُترنے کی کوشش ضرور کر سکتے تھے۔ جس میں وہ مصروف رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔ پروین کی مخالفت کا ایک سبب اُس کی اَنا بھی تھی۔ اور بقول ڈاکٹر ناظم جعفری:

’’حلقۂ احباب میں اور عزیزوں میں وہ اسی وجہ سے کسی حد تک بدنام تھی۔‘‘(ص99)

اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ پروین شاکر اپنے مقام و مرتبے سے بھی آگاہ تھی اور اُسے اپنی عزتِ نفس کا بھی احساس تھا اور اس پر نہ تو وہ کوئی آنچ آنے دینا چاہتی تھی اور نہ اِس حوالے سے کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار تھی۔ وہ عزت اور وقار کے ساتھ اپنے مقام اور منصب سے انصاف کرنے کی قائل تھی۔ یہی اُس کا جُرم تھا اور اسی سبب اُس کے مخالفین بھی زیادہ تھے۔

اور نجمہ خانم ملک کے بقول:

’’چالاک خود غرض اور مفاد پرست لوگوں نے پروین کی شہرت اور ترقی کو پھلتا پھولتا دیکھ کر ایسی چال چلی کہ پروین کے بارے میں افواہیں اُڑا کر پروین کے ہر قریبی عزیز رشتہ دار اور دوستوں کو اُن سے بدگمان کر دیا جائے کیونکہ جب تک ان مخلص لوگوں کا حصار نہیں ٹوٹے گا اُس کو بدنام کرنا، اسکینڈل بنانا اور خوف زدہ کرنا آسان نہیں ہوگا اور وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔‘‘(ص35)

پروین شاکر سادہ دل اور معصوم سی شاعرہ تھی۔ وہ اِتنی مردم شناس نہیں تھی۔ وہ اپنے ملنے جُلنے والے لوگوں کو مخلص سمجھتی تھی مگر اُس کے اِرد گرد ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے جو اُس کے کردار پر کیچڑ اُچھالتے اور اُس کی شہرت سے حسد کرتے اور اُسے ترقی کی راہ سے ہٹانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ وہ بے خبری میں حسد و انتقام کے شعلوں میں گھری رہی۔

نجمہ خانم ملک کے بقول:

''کسٹم کے اندر جہاں اعلیٰ ظرف اور وسیع القلب لوگ اُن کے ساتھیوں میں تھے، اس کے ساتھ ہی اعلیٰ مرتبہ یا چھوٹے مرتبہ کے کم ظرف لوگ بھی تھے۔ جس کو بھی پروین کی ذاتی گھریلو زندگی میں کوئی کمزوری پتا چلتی، وہ بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا۔''
(ص34)

نجمہ خانم ملک نے پروین شاکر کی زندگی کے اور بھی کئی واقعات لکھے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ شروع ہی سے حاسدین پروین کے راستے میں روڑے اٹکانے میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔

نجمہ خانم ملک کہتی ہیں کہ پروین مشاعروں میں شرکت کے لیے جاتی تو:

''حاسد لوگوں نے دونوں (باپ اور اُن کے دوست سیّد ماجد حسین، ان دونوں کے خاندان تقریباً 25 برس ایک ہی گھر میں رہے) کے کان بھرنا شروع کر دیے تو لازمی بات ہے کہ محتاط ہونا ہی پڑتا ہے۔ چچا (سیّد ماجد حسین) کے قریبی عزیز کے بیٹے سے کم سِنی میں نسبت طے تھی جس کا کم از کم یہ فائدہ تو ہوا کہ بہت سارے امیدوار غلط قسم کے لوگ اس بات کو جان کر حد میں رہے۔'' (ص12)

یہ غلط قسم کے لوگ کون تھے؟ گو مصنّفہ نے ان کو ظاہر نہیں کیا مگر اُن کے عزائم ضرور سامنے آ گئے۔ یہ نسبت اُن لوگوں کو حد میں رکھنے میں تو کامیاب رہی مگر خود قائم نہ رہ سکی، کیونکہ دونوں طرف کے فریقین کو یہ احساس ہو گیا کہ مستقبل میں یہ ایک دوسرے کے لیے ناموزوں اور نامناسب رہیں گے۔ اِس طرح خاموشی سے راستے ضرور بدل گئے، مگر دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ نارمل انداز میں مسلسل ملتے رہے۔

پروین شاکر کی ایک داستانِ عشق، جس کا ذکر دیگر اہلِ قلم نے بڑی تفصیل اور چسکے لے لے کر بیان کیا ہے، اُس کا ذکر نجمہ خانم ملک نے بھی کیا ہے۔ گو دیگر حضرات نے اس واقعے کو یونیورسٹی کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد کا کہا ہے مگر نجمہ خانم ملک صاحبہ لکھتی ہیں:

''کراچی یونیورسٹی کے زمانے میں وہ ایک شخص (مصنّفہ نے اُس کا نام نہیں لکھا مگر فرحت پروین ملک اُس کا نام اسد اشرف ملک بتاتی ہیں جو اس وقت

ایک عام سرکاری ملازم تھا مگر بعد میں ایک اہم بیورو کریٹ کے طور پر سامنے آیا) جو پروین کی زندگی اور سوچ کا انقلابی ہوا، آج کراچی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور ملک وقوم کی خدمت سچائی اور دیانت داری سے کر رہا ہے۔ پروین نے اُسے اپنا آئیڈیل سمجھ کر مستقبل کا خواب اُنھی سے وابستہ کرلیا تھا۔ پروین کی خواہش پر جب وہ اور اُن کے گھر والے ملنے آئے تو یقیناً ایک لاجواب انتخاب تھا۔ کہیں کوئی کمی نہ تھی، صرف فرقوں کا فرق، جس نے ممکن کو ناممکن بنا دیا۔ اُن کی اعلیٰ ظرفی اور شرافت اور کردار کی عظمت نے اس گھرانے پر کبھی حرف نہ آنے دیا اور ہمیشہ اس گھر کی دُعائیں اور نیک تمنّائیں، اعلیٰ قدر جذبہ ان کے گھر والوں کے مرہونِ منت رہے گا اور ہمیشہ اُن کی بیوی اور وہ خود پُرخلوص فراخ دِلی، انکساری اور جذبۂ انسانیت کے گراں قدر جذبات کے ساتھ اِس خاندان کے کام آنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ (ص 14-15)

عالیہ جلیل شاہ جسے ہرجائی اور عام گھر کی لڑکی سے شادی کرنے سے گریزاں لکھتی ہے اور احمد پراچہ جو اُس کے حوالے سے کہتے ہیں کہ وہ شادی جیسے پاکیزہ بندھن کاروباری، ذاتی مفاد اور کیریئر کی بہتری کا زینہ سمجھتا ہے، نجمہ خانم اُس کی شرافت، کردار کی عظمت اور اُس کی اعلیٰ ظرفی کی تعریف کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ اُس کی بیوی بھی پُرخلوص فراخ دِلی، انکساری اور انسانیت کے گراں قدر جذبے کے تحت اِس خاندان کے کام آنے کے لیے اب بھی بے چین رہتے ہیں۔ عشق کی اِس داستان کو بہت سے مہربانوں نے بیان کیا ہے اور خوب مزے سے کیا ہے۔ بات صرف اِتنی ہے کہ ایک شخص کو وہ پسند کر بیٹھی اور اُس کی خواہش پر اُس کا رشتہ بھی آیا مگر پروین شاکر کے والد مختلف مسلک یا فرقہ کی بنیاد پر مسترد کر دیا اور پروین نے باپ کے اِس فیصلے یا حکم کے آگے ایک فرماں بردار بیٹی کی طرح سر جھکا دیا۔ نہ کوئی بغاوت، نہ کوئی غلط قدم۔ بس ایک خاموشی۔ اور پھر اُس کی زندگی میں کبھی ذکر تک نہیں آیا۔ ویسے بھی یہ کوئی اِتنا بڑا جرم نہیں تھا بلکہ اِتنی اجازت تو لڑکی کو ہمارا دین بھی دیتا ہے۔

اگر بات یہاں تک ہی رہنے دی جاتی کہ پروین شاکر کی پسند اور خواہش پر رِشتہ آیا مگر باپ نے انکار کر دیا، تو اس میں ہرج کیا تھا مگر ہم تو پروین شاکر کے دِل کی خراشیں گننے بیٹھ گئے

اور تا حال گِن رہے ہیں۔ اللہ معاف کرے۔

محترمہ نجمہ خانم ملک نے پروین شاکر کی شادی کی بھی تفصیل بیان کی ہے اور کئی نئی باتوں کا انکشاف کیا ہے۔

نجمہ خانم ملک کے مطابق نصیر نے اپنی ماں سے خود اِس خواہش کا اظہار کیا لیکن نصیر کے والدین اس پر برہم ہو گئے اور تیار نہ ہوئے۔ نصیر کے احتجاج کے آگے با دِلِ نخواستہ تیار ہو گئے اور اپنے چھوٹے بھائی مظاہر حسین کے ذریعہ رشتہ بھیجا۔ پروین شاکر نے احمد ندیم قاسمی صاحب سے گزارش کی کہ وہ کراچی آ کر موصوف اور اُس کے اہلِ خانہ سے مل کر فیصلہ کریں۔ قاسمی صاحب نے ملاقاتوں کے بعد اپنی پسندیدگی کی سند جاری کر دی اور پروین بھی ان سارے گھر والوں کے والہانہ مگر منافقانہ رویّے کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس لیے اُس نے بھی حامی بھر لی۔ مگر پروین کی والدہ اِس رشتے پر خوش نہ تھیں۔ وہ خوف زدہ تھیں کہ یہ بدمزاج لوگ ہیں اور پروین وہاں خوش نہیں رہ سکے گی۔ نصیر کی والدہ، پروین کی والدہ کی ماموں زاد بہن تھی اور انڈیا میں نصیر کی والدہ کا سسرال، پروین کی والدہ کے پڑوس میں ہوا کرتا تھا۔ وہ نصیر کی والدہ کے طور طریقوں اور بدمزاجی سے اچھی طرح واقف تھی۔ اِس لیے وہ پریشان بھی تھی اور خوف زدہ بھی۔ اور بعد میں اُن کا خوف درست ثابت ہوا اور بہت بعد میں اُس خاندان کا ظاہر باطن بھی کھلا کہ نصیر کی والدہ تو کسی امیر گھرانے کی بہو لانے کے خواب دیکھا کرتی تھی، اور یہ رشتہ تو محض نصیر کی ضد پر کر رہی تھی۔ والدہ کے خدشات اپنی جگہ، پروین کی بڑی بہن نسرین نے تو باقاعدہ پروین کو سمجھایا کہ:

> ''میں تمھیں اپنے مشاہدے کی روشنی میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کے تم ان کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں، تم پچھتاؤ گی۔'' (ص 18)

مگر پروین شاکر کے لیے احمد ندیم قاسمی صاحب کی پسندیدگی کی سند اور اُن کے گھر والوں کا والہانہ (مگر منافقانہ) رویّہ ہی تسلّی کے لیے کافی تھا۔

نسرین شاکر نے پھر ڈاکٹر نصیر علی کو گھر بلا کر کہا:

''دیکھیے ڈاکٹر صاحب! پروین ان لوگوں میں سے ہے، جن کے لیے بہت سی زبانیں بولنے والی، بہکانے والی اور بہت سے قلم تنقید کرنے والے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ حاسدوں میں گھرے رہتے ہیں۔ اگر آپ میں یہ ظرف ہے کہ آپ ہر قسم کی بات سُن کر برداشت کر سکتے ہیں تو فیصلہ کریں ورنہ ان کے لیے رشتہ کی کمی نہیں۔'' (ص 18)

اِس پر ڈاکٹر نصیر کے الفاظ یہ تھے:

''آپ یقین کریں میری ذات سے آپ لوگوں کو اور پروین کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور ان تمام باتوں کی میں قطعی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہے گا۔'' (ص 18)

ڈاکٹر نصیر کی اِن باتوں سے گھر والوں کو کافی تسلّی ہوئی اور وہ مطمئن ہو گئے مگر والدہ پھر بھی خوف زدہ ہی رہیں۔

14 اکتوبر 1976ء کو پروین کی شادی ہوگئی اور پروین سسرال منتقل ہوگئی۔ شادی کا یہ بندھن گیارہ برس قائم رہا۔ سسرال میں پروین کو بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور ڈاکٹر صاحب کا رویّہ بھی سرد ہی رہا۔ مراد کی پیدائش پر بھی ماں اور دیگر رشتہ داروں کے کہنے پر اُسے دیکھنے ہسپتال میں نہ آیا اور پروین کے رونے دھونے پر دو دِن بعد تشریف آوری ہوئی۔ C.S.S. کے بعد لاہور ٹریننگ پر جانے اور مراد کی دیکھ بھال کے حوالے سے بھی بدمزگی پیدا ہوئی اور بدگمانی بڑھی۔ ٹریننگ کے بعد کراچی تعیناتی ہوئی۔ سرکاری رہائش گاہ میں ساتھ رہتے ہوئے بھی ڈاکٹر صاحب گھر والوں ہی کے زیادہ قریب رہے۔ گھر میں ایک سرد جنگ کا سلسلہ جاری رہا اور نصیر صاحب اب بار بار یہ کہتے ہیں:

''اب ساتھ گزارہ نہیں ہوسکتا۔'' (ص 28)

سرد جنگ اور اِس رویّے سے تنگ آ کر پروین شاکر نے 1986ء میں اسلام آباد تبادلہ کروالیا۔ جس سے مسائل مزید بڑھے اور نصیر صاحب نے پروین شاکر کے والد صاحب کو صاف صاف کہہ دیا:

''وہ لکھنا پڑھنا اور سروس کرنا چھوڑ دیں۔ مکمل گھریلو بیوی بن کر رہنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ناممکن ہے۔ میں دُنیا کی باتوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔'' (ص 28)

یہ وہی نصیر صاحب ہیں جنھوں نے شادی سے پہلے کہا تھا کہ:

''میں لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کرتا اور پروین کو میری طرف سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔''

محترمہ نجمہ خانم ملک نے، نصیر صاحب نے جو فیصلہ سنایا ہے اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اب دُنیا والے خود ضمیر کی عدالت میں یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس سے بڑا روحانی قتل اور جرم کیا ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نصیر کو یہ یقین تھا کہ پروین علم کے شوق میں ہر دُکھ اور ذِلّت برداشت کر لیں گی لیکن علم سے محبت کی یہ سزا برداشت نہیں کر سکتیں اِس لیے خود راستے سے ہٹ جائیں گی۔'' (ص 18)

اِس بیان سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نصیر اب پروین کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اِسی لیے اِتنی کڑی شرائط رکھی ہیں۔ پروین اپنے گھر کو برباد ہوتا دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر جب مرد فیصلہ ہی کر لے تو پھر کیا چارہ باقی رہتا ہے۔ اپنی بے بسی اور دُکھ کا اظہار یوں کیا ہے:ؔ

میں آندھیوں کی مزاج آشنا رہی ہوں مگر
خود اپنے ہاتھ سے کیوں گھر کو منہدم کر لوں

اُس نے خود تو اپنے گھر کو منہدم نہیں کیا مگر آندھیوں کے سامنے زور نہیں چل سکا اور آخر کار گھر بکھر کر رہ گیا۔

بہر حال 1987ء علیحدگی ہو گئی اور مشکلات کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ انتہائی مشکل اور کٹھن دور۔ گو رفاقت جاوید اور پروین قادر آغا نے کافی ساتھ دیا۔ کچھ سنبھلی تو اعلیٰ تعلیم کے لیے 1990ء میں امریکہ چلی گئی۔ مگر وہاں بھی مسائل نے پیچھا کیا۔ سکالرشپ بھی منسوخ ہوا۔ بیمار بھی

رہیں۔ یوں پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ بعنوان ’’پاک بھارت جنگ 1971ء میں میڈیا کا کردار‘‘ مکمل نہ کرسکیں۔ یہ حسرت دل میں لیے کرب ناک تنہائی، عدم تحفّظ کا احساس اور ادبی بھیڑیوں کے خوف ناک حملوں سے بچتی بچاتی، گیتو کے مستقبل کے سنہرے خواب اور اپنے مسائل اور دُکھ سمیٹ کر 26 دسمبر 1994ء کی بھیگتی ہوئی صبح کو دفتر جاتے ہوئے ایک خونی حادثے کے سبب اِس فانی دُنیا کو خیرباد کہہ گئیں اور خاک کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو گئیں اور ڈاکٹر نصیر سے جو شکایت اور شکوہ تھا، اُس کی صدا اُس کے مرنے کے بعد بھی فضا میں گونجتی رہے گی۔

بھیڑیے مجھ کو کہاں پا سکتے
وہ اگر میری حفاظت کرتا

❁❁❁❁❁

کتابیات

1۔ احمد ندیم قاسمی، ''میرے ہم قدم''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2007ء
2۔ احمد پراچہ، ''پروین شاکر، احوال و آثار''، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، 2003ء
3۔ اشفاق احمد ورک ڈاکٹر، ''قلمی دشمنی''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، 1992ء
اشفاق احمد ورک ڈاکٹر، ''خاکہ نگری''، کراچی، اکادمی بازیافت، 2002ء
4۔ خلیل احمد (مرتب) ''اُردو کے شاہکار خاکے'' جلد اوّل، لاہور، فکشن ہاؤس، 2017ء
5۔ رضیہ فصیح احمد، ''گُل دستے، گُل دائرے''، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، 2023ء
6۔ رفاقت جاوید، ''پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا''، اسلام آباد، پروین شاکر ٹرسٹ، 2014ء
7۔ زاہد حسین بھٹی، ''کاندھے پہ دھرے ساز''، لاہور، غالب نما، 1998ء
8۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، ''خوشبو کی ہم سفر''، اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، 2002ء
9۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، ''پروین شاکر، شخصیت اور فن''، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، 2007ء
10۔ شاہد حنائی (مرتب)، ''نسوانی خاکے''، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، 2015ء
11۔ عالیہ جلیل شاہ، ''تنہا چاند''، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 1997ء
12۔ عرفان جاوید، ''سرخاب''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2020ء
13۔ فرحت پروین ملک، ''یادوں کا سُندر بن''، کراچی، دربارِ ادب، 2022ء
14۔ مرحب قاسمی ڈاکٹر، ''چنیدہ شنیدہ، حیدر آباد، مطبوعات سندھن، 2010ء
15۔ ممتاز مفتی، ''اوکھے اَولڑے''، لاہور، فیروز سنز، 1995ء
16۔ نجمہ خانم ملک، ''پروین شاکر سوانحی خاکہ و دیگر مضامین''، اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، س۔ن

رسائل

''ماہِ نو''، پروین شاکر نمبر، لاہور، جلد75، شمارہ 03

کتابی سلسلہ

ادبِ عالیہ۔2 ،کراچی، ادبِ عالیہ پبلی کیشنز، مارچ 2017ء

اخبارات

1۔ روزنامہ جنگ لاہور، 02 جنوری، 1995

2۔ روزنامہ جنگ لاہور، سنڈے ایڈیشن، 15 اکتوبر 2017ء

3۔ روزنامہ جنگ لاہور، سنڈے ایڈیشن، 22 اکتوبر 2017ء

4۔ روزنامہ جنگ لاہور، سنڈے ایڈیشن، 29 اکتوبر 2017ء

غزل

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شب تنہائی کی

اُس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

پروین شاکر